سَوغاتِ دانش

یکے از تصنیفاتِ

علاّمہ نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی

خانۂ حِکمت ○ اِدارۂ عارف

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	آغازِ کتاب	۴
۲	سوال کا مقصد	۱۰
۳	مرتبۂ عقل اور مرکزِ تاویل	۲۶
۴	قرآن میں تصوّرِ "یداللہ"	۴۰
۵	قرآنی پہاڑ اور جواہر	۴۹
۶	لنڈن سے پانچ سوال	۵۹
۷	سورۂ ماعون کی تاویل	۷۳
۸	اُمّ الکتاب کی حکمت	۷۶
۹	سورۂ بروج کے تاویلی اسرار	۸۵
۱۰	امریکا سے دو سوال	۸۹
۱۱	سورۂ قیامت	۹۵
۱۲	تجلّیات و ظہورات	۱۰۱
۱۳	کتابِ مکنون	۱۰۴

ISWLS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴	انفرادی روح اور جماعتی روح	۱۰۷
۱۵	علمی اور روحانی رشتہ	۱۱۱
۱۶	عالمِ خواب کی حکمتیں	۱۱۴
۱۷	یکجان بہت سے قالب	۱۲۱
۱۸	روحانی محبّت، وحدت کی علامت	۱۲۴
۱۹	ایک سب۔ سب ایک	۱۲۷
۲۰	علمی خدمات کی لذّتیں	۱۳۱
۲۱	کشتیٔ علم	۱۳۴
۲۲	ذکرِ جلی	۱۳۷
۲۳	فرشتہ بصورتِ انسان	۱۴۰
۲۴	خوشبوؤں کی دنیا	۱۴۴
۲۵	سورۂ لقمان سے اہم سوالات	۱۴۸
۲۶	حکمتِ شکر	۱۶۰

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آغازِ کتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پروردگارِ عالم کے فضل واحسان اور حضرت محمد مصطفٰے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علمی وعرفانی صدقے سے، جو امامِ زمان صلوٰت اللہ علیہ کے توسط سے حاصل ہے، یہ کتاب بنامِ "سوغاتِ دانش" قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، اس مسرت وشادمانی کے مبارک موقع پر بندۂ خاکسار کا دل تو یہ چاہتا ہے کہ موسمِ بہار کی بارش کی طرح عاجزانہ شکرگزاری کے بہت سے آنسو بہائیں، اور بار بار احسان مندی کے سجدے کرتے رہیں، لیکن اس ناچیز بندے کے لئے ایسی نعمت شناسی اور قدردانی آسان نہیں۔

سوغات اصلاً ترکی لفظ ہے، جو عمدہ چیز، نرالی چیز، تحفہ، ہدیہ، اور رہ آورد (سفر سے دوستوں کے لئے تحفہ) کے معنی رکھتا ہے، اور یہ فارسی کے علاوہ اردو ادب میں بھی مستعمل ہے، چنانچہ انہی معنوں کے ساتھ اس پیاری کتاب کا نام "سوغاتِ دانش" مقرر کیا گیا، تاکہ اعزّہ، احباب، جماعت اور قوم

کے لئے یہ کتاب یقیناً ایک بہترین علمی تحفہ ثابت ہو سکے، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

کتابِ "سوغاتِ دانش" چند مختلف موضوعات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر موضوع کی جیسی اور جتنی اہمیت ہے، وہ آپ کو بوقتِ مطالعہ معلوم ہو جائے گی، اس میں اگرچہ بعض مضامین خطوط کے عنوان سے مندرج ہیں، مگر وہ خاص علمی مکتوبات ہونے کی وجہ سے بے حد ضروری اور انتہائی مفید ہیں، اور اس پُرحکمت عمل کا حکم حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے فرمانِ اقدس میں موجود ہے، جس کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ دینی علم کے لین دین کے سلسلے میں خط و کتابت سے بھی کام لینا چاہیئے۔

خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کے سلسلۂ کُتُب اور تحریروں میں بحیثیتِ مجموعی جن اساسی اور اہم ترین موضوعات سے بحث کی جاتی ہے، ان کی مثال یہ ہے: علمِ توحید، یک حقیقت، تصوّرِ آفرینش، نبوّت، امامت (امام شناسی)، اسلام و ایمان، روح و روحانیت، قیامت اور متعلقات، قرآن اور اس کی تاویلی حکمت، مذہب اور سائنس، تصوّرِ انسان، ذکر و بندگی، علمی خدمت، حقیقی علم، تقویٰ، بہشت اور اس کی نعمتیں وغیرہ، اس کے علاوہ یہاں ایک بہت بڑا موضوع سوال و جواب بھی ہے۔

ہماری نیّت اور مقصد یہ ہے کہ اپنی عزیز اور عظیم جماعت کی کچھ نہ کچھ علمی خدمت کر سکیں تاکہ فردائے قیامت خدا تعالیٰ کے حضور میں ہمیں اس بات کی شرمساری نہ ہو کہ اُس بڑے مہربان نے علم کی جن بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا، اُن سے دوسروں کو کیوں فائدہ نہیں دلایا؛ جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (۱۰۲:۸) پھر اُس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہوگی۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس دنیا میں جن لوگوں کو علمی یا مادّی دولت عطا کر دی ہے، وہ اگر اس میں سے راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے ہیں، تو قیامت کے دن بڑی سختی کے ساتھ اُن سے سوال کیا جائے گا۔

اس سلسلے کا دوسرا ارشاد یہ ہے: (ترجمہ) دردناک سزا کی خوشخبری دو اُن کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔۔۔(۹:۳۴-۳۵) اس قرآنی تعلیم میں ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی دولت کا ذکر ہے، اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ باطنی دولت علم ہے، جس کا راہِ خدا میں خرچ کرنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

تیسرا حکم یہ ہے (ترجمہ): اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا، جس کے ذمّے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو

اور وہ اسے چھپائے" (۱۴۰/۲) یعنی حقیقی علم کی ہر بات حق و صدق کی گواہی کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ اگر کسی شخص کے پاس ایسا ضروری اور مفید علم ہے، جس کے ظاہر کرنے سے اہلِ ایمان کو فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہو، تو اس صورت میں علم کو نہیں چھپانا چاہیئے، مگر ہاں، اصولِ تقیہ اپنی جگہ پر ہمیشہ قائم رہیگا۔

ہمارے عظیم المرتبت پیروں اور بزرگوں نے ماضی میں دعوتِ حق اور علمِ امامت کے سلسلے میں جو بے مثال کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ عظمت و بزرگی کے آسمان پر ہیں، ہمیں کماحقّہٗ خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے اپنے پیروں کی عزت کو جُھک جُھک کر سلام کرنا چاہیئے کہ ہماری ہستی ان کی خاکِ پا سے بنائی گئی، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرات دین کے جس کھیت اور باغ میں شب و روز چل پھر کر کام کرتے تھے، اسی کی مٹی سے ہمارے اعتقادی وجود کا گارا بنایا گیا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم کسی قسم کی بڑائی کا دعویٰ کریں؟ اور کیوں؟

یہ عزیز کتاب جو سوغاتِ دانش کے پیارے نام سے آپ کے سامنے ہے، اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۴ء میں "گنجِ گرانمایہ" کی تصنیف سے قبل تیار ہوئے تھے، لہٰذا "سوغاتِ دانش" اور "گنجِ گرانمایہ" کے آپس میں زیادہ سے زیادہ قریبی تعلق ہے، جبکہ یہ دونوں ارتقائی سیڑھی کے ایک ہی زینہ

پر واقع ہیں۔

جب کوئی نیک کام ادارے کے طریق پر انجام پاتا ہے، تو اس کا قانون یہ ہے کہ اس کو ادارے سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس کے لئے تین پہلو ہیں: ادارے کے صدر کی شکرگزاری کرنی پڑتی ہے، یا ادارے کا تذکرہ ہوتا ہے، یا اُن تمام افراد کا شکریہ کیا جاتا ہے، جو ادارے سے منسلک ہیں، یہ تو ہر عام ادارے کے اصول کی بات ہوئی، لیکن جہاں جہاں خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کا بابرکت وجود ہے، وہاں بفضلِ خدا اتحاد و یگانگت کا ایک خاص معجزہ پایا جاتا ہے، جس کی ایک عمدہ مثال خانۂ حکمت برانچ گلگت ہے، جو ہمارے بہت ہی عزیز دانشور صدر غلام قادر کی کامیاب صدارت میں ترقی کر رہی ہے، چشمِ بد دور! غلام قادر کے ظاہر و باطن پر امامِ زمانؑ کے نورِ محبت کی شعاعیں برس رہی ہیں۔

اگر یہ بندۂ کمترین خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کے دونوں صدر صاحبان فتح علی حبیب اور محمد عبدالعزیز کا ذکرِ جمیل نہ کرے اور دونوں اداروں کے تمام شرقی اور غربی عملداروں اور ممبروں کے زرّین کارناموں کو نہ سراہے، تو اس خاکسار سے بہت بڑی ناشکری اور بے وفائی کا اِرتکاب ہوگا اور دوسری طرف سے مستقبل کے مؤرخین کو یہ غلط فہمی ہوگی کہ یہ ساری علمی خدمت تنہا نصیر

ہونزائیؒ نے انجام دی تھی، لہٰذا میں ناچار اپنے ان تمام فرشتوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں جو میرے لئے گوناگون قوتوں کے خزانے ہیں، جو شب و روز علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، وہ دونوں بیشک صدر صاحبان ہیں، اس لئے عزّت و برتری کے معنی میں ہمارے سر آنکھوں پر بیٹھ سکتے ہیں، لیکن ان کی عاجزی اور درویشی کی یہ شان ہے کہ اکثر کرسئ صدارت کو چھوڑ کر کسی ایسی عام خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں، جو ان کے نزدیک کسرِ نفسی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

خداوندا! تو اپنی بے پایان رحمت سے جملہ عزیزانِ شرق و غرب کو حقیقی علم کی دولت سے مالامال فرما! تاکہ ہم سب مل کر خلوص اور خیرخواہی سے امامِ عالی مقام علیہ السّلام اور پیاری جماعت کی بہتر سے بہتر خدمت کر سکیں، آمین یاربّ العٰلمین!

بندۂ کمترین

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

جمعرات ۱۶ ذی الحجّہ ۱۴۰۴ھ

۱۳ ستمبر ۱۹۸۴ء

سالِ مُوش

سوال کا مقصد فروغِ علم ہے

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ الحمد للہ ربّ العالمین۔ وَالعاقبۃ للمتّقین۔ والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ رسولہٖ وعلیٰ آلہٖ الطّاھرین۔ واضح رہے کہ سوال مختلف وجوہ کی بنا پر کیا جاتا ہے اس لئے سارے سوالات کا ایک جیسا پس منظر نہیں ہو سکتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور مسرّت انگیز سوال وہ ہوتا ہے، جو حلقۂ احباب کی طرف سے محض فروغِ علم کی خاطر پیدا ہو جاتا ہے، اس نوعیّت کے سوال وجواب سے دوستی، محبّت، یگانگت، اخلاص اور اعتماد کی خوشبو آتی ہے، چنانچہ یہ بندۂ ناچیز اپنے علمی عزیزوں اور عالی مرتبت دانشور دوستوں کا واجبی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے کہ وہ حضرات وقتاً فوقتاً ایسے عمدہ اور فکر انگیز سوالات لکھ کر بھیجتے ہیں، جو نہ صرف دوستانہ خلوص واعتماد کے حامل ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی اعتبار سے بھی انتہائی

بلند اور بیحد مفید ہوا کرتے ہیں، جیسے ذیل میں ہمارے ایک عظیم دانشور دوست نے تین ایسے سوالات کئے ہیں:۔

سوال نمبر ۱ : یہ ایک حقیقت ہے کہ امامِ زمانؑ حقیقی علم کے خازن ہیں اور وہی اپنے پاک علم کے ذریعہ لوگوں کو مرگِ جہالت سے نجات دلاتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ امامؑ کے اس علم کی وسعت یا پھیلاؤ کتنا ہے اور وہ کن کن ذرائع سے طالبانِ علم کو علم بخشتے ہیں؟ مزید یہ کہ تصوّرِ علم اور تصوّرِ نجات کے درمیان کیا رشتہ ہے؟

سوال نمبر ۲ : وجود کیا ہے؟ روحانی اور جسمانی وجود کی اہمیت کیا ہے؟ اور ان دونوں کے درمیان رشتہ کیا اور کیسا ہے؟ وجود کے رشتہ سے عدم کی کیا حقیقت ہے؟ ان دونوں میں سے کون سا مقدّم ہے؟

سوال نمبر ۳ : انسان کے اندر موجود جنسی یا شہوانی خواہش میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟ بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار میں اس قوت کی طرف ہمارا کیا رویّہ ہونا چاہیئے؟ مذہب کی طرف سے عائد شدہ پابندیاں اضافی ہیں یا مطلق؟ خصوصاً مغرب کی جنسی بحران میں ایک مومن کا کیا کردار ہونا چاہیئے؟

جواب نمبر ۱ : اس سوال کے تین اجزاء ہیں : الف : علم کا پھیلاؤ؟ ب : علمی ذرائع؟ ج : علم اور نجات کا رشتہ؟ اب یہ بندۂ کمترین

جو امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے علمی غلاموں کا ایک ادنیٰ غلام ہے،
انتہائی عاجزی، ادب، خلوص اور جذبۂ فداکاری سے سرشار ہو
کر عرض کرتا ہے کہ یقیناً امامِ اقدس و اطہرؑ حقیقی اور روحانی علم
کے خازن ہیں، امامِ زمانؑ کا علم جو دراصل خداوند تعالیٰ کا علم ہے
وہ بتقاضائے حکمت محدود و یکجا بھی ہے اور بسیط و وسیع بھی؛
علم جن معنوں میں جمع اور یکجا پایا جاتا ہے، اُن معنوں میں وہ ایک
خزانے کے اندر موجود ہے، جیسے قرآنِ حکیم (۱۵/۲۱) میں تمام چیزیں
خزائنِ الٰہی میں محدود ہونے کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور جہاں علم اپنے
سرچشمہ اور خزانہ سے نکل کر پھیلا ہوا ہے، وہاں اس کا دائرہ یا
پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، ہر چند کہ علم اپنے جوہر یعنی لوگوس عقل میں
کوئی مادّی شئی کی طرح نہیں کہ اس پر طول و عرض و عمق کا اطلاق ہو
لیکن کتابِ کائنات میں جس طرح اس کو ایک حکمت آگین جسمانی
صورت دی گئی ہے، اس کے پیشِ نظر علم کے پھیلاؤ کا نظریہ بالکل
درست ہے، چنانچہ سرچشمۂ علم اور اس کے پھیلاؤ کی مثالیں یا دلیلیں
یوں ہیں:-

۱- اس میں اہلِ دانش کو ذرّہ بھر شک نہیں کہ علم حقیقی اور روحانی
صورت میں نورِ خداوندی ہے، جس کا ایک سرچشمہ ہے اور ایک
پھیلاؤ، اس سرچشمہ کی تشبیہہ قرآنِ پاک میں ایک روشن چراغ سے
دی گئی ہے، جو ایک طاق میں ہو، اور اس کی روشنی کے پھیلاؤ کی حدود

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

کائنات کی حدود بتائی گئی ہیں (۲۱:۵۷) لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ علمِ مجتمع کا سرچشمہ امامِ زمانؑ ہیں اور علمِ منتشر کا پھیلاؤ کائنات کے برابر ہے۔

۲۔ عقل یعنی علم، روح اور جسمِ لطیف سے بہشت بنائی گئی ہے اور یہ تین چیزیں حقیقی معنوں میں امامِ زمانؑ کی مبارک ہستی میں موجود ہیں، لہٰذا مرکزِ بہشت اور مجموعۂ جنت بحکمِ آیۂ سورۂ یٰسٓ (۱۲:۳۶) امامِ عالیمقامؑ ہیں، اور دوسری طرف سے بہشت کا طول و عرض آسمان و زمین کے برابر ہے، جیسے سورۂ آلِ عمران (۱۳۳:۳) اور سورۂ حدید (۲۱:۵۷) میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ نورِ علم جو بمعنیٰ دیگر مرکزِ بہشت بھی ہے، وہ امامِ زمانؑ کی مقدس و مبارک پیشانی میں ہے اور اس کی روشنی کائنات کے ظاہر و باطن پر محیط ہے۔

۳۔ علم فعلِ قلوب میں سے ہے، عالِم اس کا فاعل ہے، اور عالَم (کائنات) اسمِ آلہ ہے، جیسے خاتَم مہر لگانے کا آلہ ہوتا ہے، ویسے عالَم علم (یعنی جاننے) کا آلہ ہے، مگر حقیقی عالِم خدا و رسولؐ کے بعد امامِ زمانؑ ہیں، جن کو کائنات و موجودات کا علم بصورتِ نورِ عقل عطا کیا گیا ہے، پس سرچشمۂ علم جیسا کہ ہونا چاہیئے امامِ وقتؑ ہیں اور اس کا احاطہ دائرۂ کائنات ہے۔

۴۔ علم جیسے اصل و سرچشمہ کے طور پر ایک نور ہے، اور جس

طرح اپنے پھیلاؤ میں ایک کائنات، اسی طرح وہ کسی کمی کے بغیر ایک مکمل آسمانی کتاب میں بھی ہے، اور وہ پرحکمت کتاب قرآنِ مجید ہے، اور اس کی زندہ روح یعنی نور، حقیقی عالم، اور وارث امامِ برحق علیہ السّلام ہیں۔

اب سوال اوّل کا یہ حصّہ سامنے آتا ہے کہ "امام کن کن ذرائع سے طالبانِ علم کو علم بخشتے ہیں؟" اس باب میں میری گزارش یوں ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے، اور اس حقیقت سے کوئی دیندار انکار نہیں کرے گا اور خدا کی نعمتیں ظاہر میں بھی ہیں اور باطن میں بھی، جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (غرض سب کچھ) خدا ہی نے یقیناً تمہارے تابع کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں (۲۰/۳۱) اس بابرکت قرآنی تعلیم کی روشنی میں ایک ساتھ کئی حقیقتیں اُجاگر ہو جاتی ہیں، جن کو بجا طور پر اہلِ دانش ہی سمجھ سکتے ہیں، مثال کے طور پر صرف اتنا کہنا چاہیئے کہ پروردگارِ عالم نے نہ صرف جسمانی آسمان و زمین کو انسانوں کے کام میں لگا دیا ہے، بلکہ اسی طرح روحانی آسمان اور زمین کو بھی تازہ بتازہ باطنی نعمتیں پیدا کر دینے کے لئے مامور فرمایا ہے، جس طرح ظاہری آسمان و زمین کے عمل سے ظاہری نعمتوں کا سلسلہ جاری ہے، اسی طرح روحانی آسمان و زمین کے فعل سے

روحانی نعمتیں بھی جاری اور باقی ہیں، پس حصولِ علم کے دو ذریعے ہیں: ذریعۂ ظاہر اور ذریعۂ باطن، یعنی جیسے انسان کے ظاہری اور باطنی حواس ہیں، ایسے ظاہراً و باطناً علم کے دو راستے ہیں۔

جس طرح حضرت آدمؑ جسمانیت و بشریت کے باوجود خدائی روح (یعنی نور) کے حامل تھے، اور جس کے ذریعے سے آپؑ بطریقِ روحانیت اپنے وقت کے مومنین کو حقیقی علم دیا کرتے تھے اور مومنین ہی ہمیشہ روحانی پہلو کے پیشِ نظر ملائکہ کہلاتے ہیں، اسی طرح امامِ زمانؑ کے روحانی علم کا دروازہ ہمہ وقت مومنین پر کشادہ ہے، اور اس لازوال دولت کو حاصل کرنے کے لئے ہر شخص کو براہِ روحانیت آگے سے آگے بڑھ جانے کی ضرورت ہے، تاکہ وہ زمرۂ ملائکہ میں شامل ہو کر خلیفۂ خدا و رسولؐ (یعنی امامِ وقتؑ) سے براہِ راست علم حاصل کر سکے۔

قصۂ آدم میں روحانی علم کو "علمِ اسماء" کہا گیا ہے، جو اسمِ اعظم کے تحت تھا، چنانچہ اسی قانونِ الٰہی کے مطابق حضرت آدم علیہ السّلام نے فرشتہ صفت مومنین یعنی حدودِ دین کو اسمِ بزرگ کی عبادت سکھا کر اُن میں وہ خدائی روح پھونک دی جس کے توسط سے پیشرو اور پَیرو کے درمیان روحانی رابطہ قائم ہو سکتا ہے، اور یہی وہ سُنّتِ الٰہی ہے جو اللہ کے خاص بندوں میں گزر چکی ہے (۴۰/۸۵) اور خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، پس ہادیٔ زمانؑ

اسی سُنّتِ خدائی کے مطابق جو اٹل ہے، مومنین کو روحانی علم دیا کرتے ہیں (۱۷/۷۷)۔

اگر خدا اور اس کے برگزیدہ پیغمبرؐ کی طرف سے ہر زمانے کا امامؑ نورانی علم کا مالک مقرّر نہ ہوتا تو بہت سی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی میں امام شناسی کی اتنی بڑی اہمیت نہ ہوتی، جیسے قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ: اور جو شخص دنیا میں اندھا رہے گا سو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا، اور زیادہ راہ گم کردہ ہوگا، (۱۷/۷۲) اور یہ حدیث کہ: جو شخص اپنے زمانے کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت سے مر چکا ہوتا ہے اور جاہل (نادان) آتشِ دوزخ میں ہوتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت روشن ہے کہ امامِ زمانؑ ظاہراً و باطناً نورِ خدا و رسولؐ ہیں، نورِ قرآن اور اسلام ہیں اور نورِ معرفت ہیں۔

افسوس ہے کہ بہت سے لوگوں نے اِنّی جاعِلٌ فی الارضِ خلیفۃً (۲/۳۰) کا مطلب نہیں سمجھا، ارض کے لفظی معنی سیّارۂ زمین کے ہیں، اور اس سے دنیا بھر کے لوگ مراد ہیں اور ارض کی تاویل زمینِ روحانیت ہے، چنانچہ خدائے پاک و برتر کی خلافت و نمائندگی بحیثیتِ روحِ خدا اور نورِ خدا آدم علیہ السّلام کے باطن میں تھی، جس کی بدولت آپؑ روحانی طور پر مومنین کو خواہ مادّی حالت میں جہاں کہیں بھی ہوں، حقیقی علم سکھاتے تھے، اور

یہی مرتبہ ہر پیغمبر اور ہر امام کو حاصل ہے، کیونکہ دینِ حق میں خلافت و نیابتِ الٰہیہ رہتی دنیا تک جاری و باقی ہے، اگر ہم اس کے برعکس یہ خیال کریں کہ اس خلافت کا تعلق صرف ذاتِ آدمؑ ہی سے ہے اور وہ بھی صرف ظاہر میں کسی تاویل کے بغیر اور اس کا دائرہ صرف اس خطۂ زمین تک محدود تھا، جس میں حضرت آدمؑ جسمانی طور پر سکونت کرتے تھے، پھر اس صورت میں (نعوذ باللہ) خداوند عالم کی ایسی خلافت بازیچۂ اطفال قرار پائے گی اور اللہ تعالیٰ ایسی مثالوں سے پاک و برتر ہے۔

اب سوال کے اس جزو پر گفتگو کرنے کی نوبت آتی ہے کہ: "تصوّرِ علم اور تصوّرِ نجات کے درمیان کیا رشتہ ہے؟" اس میں جواباً یوں عرض ہے کہ انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے: جسم، روح اور عقل، اس کے ثواب و عقاب بھی تین تین ہیں: جسمی، روحی، اور عقلی اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ جسم سے روح اعلیٰ ہے اور روح سے عقل برتر ہے، چنانچہ نہ صرف عقلی ثواب سب سے بڑا ہے، بلکہ دوسری طرف سے عقلی عذاب بھی بے حد دردناک اور عظیم ہے، مگر سوال ہے کہ عقلی عذاب کس بلا کا نام ہے؟ جواب ملتا ہے کہ عقلی عذاب جہالت و نادانی کو کہتے ہیں، اور اس عذاب سے کوئی چیز چھٹکارا نہیں دلا سکتی ہے مگر حقیقی علم، پس علم نجات کی ضمانت ہے اور یوں کہنا بھی درست ہے کہ

علم نجات کی عملی صورت ہے، کیونکہ علم بہشت ہے جو آتشِ جہالت کے برعکس ہے اور اسی بیان میں علم اور نجات کے درمیان جیسا رشتہ ہے اس کا ذکر آگیا۔

جواب ۲: یہ سوال پانچ اجزاء پر مبنی ہے: الف: وجود کیا ہے؟ ب: وجود کی اہمیت؟ ج: جسم و روح کا رشتہ؟ د: وجود کے رشتہ سے عدم کی حقیقت؟ ھ: وجود اور عدم میں سے کون سا مقدّم ہے؟ چنانچہ یہاں سب سے پہلے وجود کی تعریف کی جاتی ہے کہ وُجُود ایک عربی لفظ ہے، جو و ج د کے مادّہ سے بنا ہے، جس کے معنی کسی چیز کو پالینا ہیں، وجود اسی معنیٰ میں ہستی کا نام ہے، وجود و عدم ایک دوسرے کی ضدّ ہیں، وجود یا ہستی کی تین قسمیں ہیں: جسمی، روحی اور عقلی، انسان تینوں کا مجموعہ یا مرکّب ہے، اشیائے جسمانی حواسِ ظاہر کے ذریعہ پائی جاتی ہیں، موجوداتِ روحانی حواسِ باطن کی مدد سے اور موجوداتِ عقلی کا ادراک عقلی قوتوں سے ہو جاتا ہے۔

روحانی اور جسمانی وجود کی کیا اہمیت ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بحوالۂ قرآنِ حکیم (۳۶/۲، ۴۹/۳۴، ۵۱/۴۹) اللہ تبارک و تعالیٰ ہر دو ضدّ چیزوں کو ایک دوسرے سے پیدا کرتا ہے اور ایک دوسرے میں فنا کر دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی تقدیم و تاخیر کے بغیر اور کسی ابتدا و انتہا کے سوا ہمیشہ ہمیشہ دنیا سے آخرت

اور آخرت سے دنیا بنائی جاتی ہے، یہ بات بطورِ خاص کائناتِ ظاہر و باطن سے متعلق ہے، اس سے یہ امرِ واقعی ظاہر ہوا کہ اگرچہ فضیلتِ روح مسلّمہ ہے لیکن جسم کی اہمیت بالکل ایسی ہے، جیسی روح کی ہوتی ہے، کیونکہ روح کبھی مادّہ یا جسم کے بغیر نہیں ہے، وہ عالمِ ذرّ میں ذرۂ جسمِ لطیف پر سوار ہو کر اِدھر اُدھر اڑتی ہے، اس دنیا میں عمر بھر جسم سے وابستہ رہتی ہے، اور پھر آخرت میں حسبِ اعمال اس کو ایک زندہ گھر خواہ لطیف ہو یا کثیف (۲۹/۶۴) دیا جاتا ہے چنانچہ پیر ناصر خسروؒ جان و جسد کی یکسان اہمیت کے بارے میں کسی مُنکرِ حقیقت سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

تو بکلّ بینا نہ ای زانکہ تو بیراہ ماندہؔ
تو بکلّ بینا شوی جان و جسد یکسانِ توست

یعنی تو (صرف جزو کو دیکھتا ہے مگر) کُلّ کو نہیں دیکھ سکتا ہے، اسی سبب سے تو گمراہ ہو چکا ہے، اگر تُو کُلّ کا مشاہدہ کرتا تو اس وقتِ جسم و جان کی اہمیت تیرے نزدیک یکسان ہو جاتی۔

روحانی اور جسمانی وجود کے درمیان رشتہ کیا اور کیسا ہے؟ اس کا ذکر جسم و جان کی اہمیّت کے بیان میں خود بخود آ گیا، تاہم یہاں بھی اس سلسلے کی ایک مثال درج کی جاتی ہے کہ وجودِ انسانی کی تخلیق اور تکمیل کا آغاز اس نطفۂ مخلوط (۷۶/۲) سے ہوتا ہے جو رِحم میں

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

داخل ہوجاتا ہے، اس میں تقدیم و تاخیر کے فرق و امتیاز کے بغیر روح بھی ہے اور مادّہ (جسم) بھی، اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو بناتی ہوئی ایک ساتھ آگے بڑھتی ہیں، اور یہی حال تخمِ درخت اور بیضۂ مرغ کا بھی ہے کہ بیج میں روحِ نباتی اور انڈے میں روحِ حیوانی پوشیدہ ہے، اس مثال سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ روحانی اور جسمانی وجود ہمیشہ رشتۂ وحدت میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔

وجود کے رشتہ سے عدم کی کیا حقیقت ہے؟ اور ان دونوں میں سے کون سا مقدّم ہے؟ اس سلسلے میں عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ عدم (نیستی) دراصل اہلِ تائید کے نزدیک ایسا نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے یعنی خدا کی بادشاہی میں کہیں عدمِ محض نہیں، بلکہ عدم مثال کی غرض سے عالمِ امر کا ایک نام ہے، چونکہ عالمِ امر "ہستئ نیستی نما" ہے، یعنی ایسا وجود، جو اپنی ذات میں یا جوہر میں وجود تو ہے مگر وہ عالمِ ابداع ہے، لہٰذا امر "کُن" کے بغیر اس کے عقلی، علمی، روحی اور جسمی ظہورات میں سے کوئی ظہور نہیں ہوسکتا، چنانچہ جس طرح مانا جاتا ہے کہ عدمِ محض سے وجود بنا، یہ ایک عام تصوّر ہے اور اس میں وجود و عدم کے ایک طرفہ رشتے کی بات ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، وہ یہ کہ جس طرح ہستی (وجود) نیستی[1] سے

---

[1] یہاں نیستی سے عالمِ امر مراد ہے جو ہستئ نیستی نما ہے۔

ہے، اسی طرح نیستی (عدم)، ہستی سے ہے اور اس میں کوئی زمانی تقدیم و تاخیر نہیں، کیونکہ دونوں ایک ساتھ کلمۂ کن کی طرح قدیم ہیں، مگر ہاں شہ کے لحاظ سے وجودِ عقلی سب سے اوّل ہے، پھر وجودِ روحانی ہے، اور آخر میں وجودِ جسمانی ہے۔

قرآنِ مقدس کے ایسے ارشادات جو آفرینش سے متعلق ہیں، اور خصوصاً ایسی آیات جو ازواج و اضداد (یعنی دن رات کی طرح جفت جفت چیزیں) کی تخلیق کے بارے میں ہیں، زبانِ حکمت سے یہ بتاتی ہیں کہ قادرِ مطلق جس طرح اس کی ذاتِ منزّہ کسی ابتدا و انتہا کے بغیر ہے اسی طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ عالمِ خلق اور عالمِ امر کو زمانی مقدم و مؤخر کے بغیر ایک دوسرے سے پیدا کرتا رہتا ہے، جیسے اس آیۂ کریمہ میں یہی حقیقت مذکور ہے: اور (خدا) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اور جس دن فرماتا ہے کہ کُن (ہو جا) تو وہ ہو جاتا ہے (۶: ۷۳) اس ارشاد میں عالمِ خلق سے عالمِ امر بنانے کا ذکر فرمایا گیا ہے، مگر اس امرِ عظیم کا تعلق انفرادی قیامت اور مشاہدۂ روحانیت سے ہے، یعنی یہ کام ایسا ہے کہ ہو بھی چکا ہے، ہو بھی رہا ہے، اور ہونے والا بھی ہے، کیونکہ یہ ارادۂ الٰہی کی بات ہے[۱] جو ظاہری وقت سے بالاتر ہے، پس یہاں دوسرے سوال کا جواب مکمل ہو جاتا ہے۔

---

[۱] اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کا ارادہ زمان و مکان کے تحت نہیں، بلکہ ہر چیز اس کے ارادے کے تحت ہے۔

جواب ۳ : اس سوال میں چار باتیں پوچھی گئی ہیں، الف: انسان کے اندر موجود جنسی یا شہوانی خواہش میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟ ب : بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار میں اس قوّت کی طرف ہمارا کیا روّیہ ہونا چاہیئے؟ ج : مذہب کی طرف سے عائد شدہ پابندیاں اضافی ہیں یا مطلق؟ د : خصوصاً مغرب کے جنسی بحران میں ایک مومن کا کیا کردار ہونا چاہیئے؟

اس باب میں عرض یوں ہے کہ خداوندِ عالم نے انسان کو اشرف المخلوقات اس معنیٰ میں بنایا ہے کہ اس کی ہستی جسم، روح اور عقل کی شرکت سے لاتعداد قوتوں اور صلاحیتوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک بہت سی حکمتوں پر مبنی ہے، مگر ہر قوت اور ہر خواہش کی حکمتوں سے فائدہ اس وقت حاصل ہو جاتا ہے، جبکہ باسعادت مومنین خداؐ رسولؐ اور صاحبِ امرؑ کے مقدس احکام پر کما حقہٗ عمل کرتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو، تو پھر خواہشِ نفس کے اعتبار سے انسان، حیوان، اور مومن و کافر کے درمیان کیا فرق ہو سکتا ہے، غرض یہ کہ ہر ادنیٰ خواہش قانونِ قدرت و فطرت کے مطابق ایک اعلیٰ خواہش کی صورت میں بدل جاتی ہے، جبکہ ہوشمند مومن صبر اور خوفِ خدا سے کام لے کر جادۂ ایمان پر آگے سے آگے بڑھتا ہے۔

بندۂ مومن کی سب سے اعلیٰ صفت قرآن میں پرہیزگاری (تقویٰ) بتائی گئی ہے، اور تقویٰ کی تعریف یہ ہے کہ مُتقی کے ساتھ

اللہ پاک ہے (۲/۱۹۴) متقی مسلمانوں میں سب سے بڑا معزز ہے (۴۹/۱۳) متقی خدا کا دوست ہے (۴۵/۱۹) متقی کے لئے وہ جنت تیار ہے جو کائنات پر محیط ہے (۳/۱۳۳) متقی کی ہر دعا، بندگی، قربانی اور نیکی قبول اور ہر مراد پوری ہو جاتی ہے (۵/۲۷) متقی قیامت کے دن خدا کا مہمان ہو گا (۱۹/۸۵) اور ہر متقی کے لئے پیغمبرؑ، امامؑ، فرقان، نور اور ذکر کی لاتعداد برکتیں حاصل ہیں (۲۱/۴۸) یہاں یہ نکتہ یاد رہے کہ تقویٰ کا تعلق سب سے پہلے عقائد و نظریات سے اور اسکے بعد اخلاقیات سے ہے، چنانچہ اخلاقی تقویٰ کی حکمت یہ ہے کہ نفس کی ہر ناجائز فرمائش کے خلاف عمل کیا جائے۔

اگرچہ ہر ایسے شخص کو جو پرہیزگار اور نورِ اسلام کا پیرو ہو، جوانی میں حضرت موسیٰؑ کی طرح پیغمبری نہیں مل سکتی ہے، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کسی بڑی روحانی دولت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نوازنے کا وعدہ فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًاؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۲۸/۱۴) اور جب (موسیٰؑ) بھری جوانی کو پہنچے اور (تحلیلِ نفس سے) درست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا اور ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ اس میں کامل و مکمل روحانیت عطا کر دینے کا اشارہ ہے۔ اس کلیۂ سماوی کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کامل انسانوں کو خداوند مہربان کے حضور سے

جو کچھ بھی ملا ہے وہ جوانی کی عمر میں ملا ہے، البتہ جوانی میں کوئی بڑا سا راز ہوگا، ہاں بہت عظیم بھید ہے، اور وہ شہوانی خواہش ہے، جس میں حکمت کے کئی پہلو ہیں، اور مختصر یہ کہ وہ آزمائشی چیز ہے، اور یہ اصلاح و تحلیل کے لئے ہے، چنانچہ اُس کے وسیلے سے خدا کے دوست حُبِّ دنیا کو حُبِّ مولا بنا لیتے ہیں، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ کوئی بھی بوڑھا آدمی خدا کا عاشق نہیں ہو سکتا ہے بغیر اس کے کہ جوانی میں یہ سعادت حاصل کرے، نہ کوئی بچہ اس شراب سے سرشار ہو سکتا ہے، نہ کوئی مخنّث اور نہ ہی کوئی خصّی، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اُس کی وجہ بس یہی ہے کہ بھرپور جوانی میں نفس کی جو شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے، اگر وہ نہ ہو تو نہ صرف روحانی ترقی کے امتحان کا وجود ختم ہو جاتا ہے بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ عروج و ارتقاء اور عشقِ الٰہی بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

کسی بھی غیر مسلم ملک کی بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کو اس کا ذاتی معاملہ سمجھنا اور روحِ اسلام کے خلاف اعمال سے خود کو بچانا لازمی ہے، ورنہ سوسائٹی کی فکر میں ہماری اپنی اخلاقی، مذہبی اور روحانی قدریں رُو بزوال ہوں گی۔

مذہب کے ایسے احکام جن میں کسی ترمیم کی گنجائش نہ ہو وہ مستقل اور اٹل ہیں، اور جیسا کہ قبلاً تفصیل سے بتایا گیا

اہلِ مغرب کی بہت سی چیزیں ان کی اپنی پیداوار ہیں، حقیقی مومن کو ان سے الگ اور دور رہنا چاہیئے۔ والسّلام۔

فقط آپ کا مخلص

نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی

۱۰ر جنوری ۱۹۸۴ء

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

مرتبۂ عقل اور مرکزِ تاویل

یہاں سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لیا جائے کہ جسم ظاہر ہے، روح باطن اور عقل باطن سے بھی باطن ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں لفظِ "عقل" کا کوئی صیغہ آیا ہے، اس میں باطن کے باطن کا ذکر فرمایا گیا ہے، جیسے سورۂ طٰہٰ (۲۰/۷) میں باطن کو "سِرّ" اور باطن کے باطن کو "اخفیٰ" کہا گیا ہے، پس قرآن کی تنزیل عقل سے روح کی طرف اور روح سے جسم کی طرف آئی ہے، اور اس کی تاویل جسم سے روح میں اور روح سے عقل کی جانب بلند ہو جاتی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اہلِ تائید قرآن کو پہلے تو ظاہر میں پاتے ہیں، اس کے بعد اپنی روحانیت میں دیکھتے ہیں، اور پھر آئینۂ عقل (یعنی گوہرِ عقل) میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:۔

بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فی صدورِ الّذین اوتوا العلم (۲۹/۴۹) بلکہ وہ (قرآن) ان لوگوں کے دل میں جن کو علم عطا ہُوا ہے روشن معجزات (کی صورت میں) ہے۔ یعنی حضراتِ اُئمّہ

طاہرین صلوات اللہ علیہم کی روح و روحانیت میں قرآنِ کریم بحیثیتِ معجزاتِ نورانی موجود ہے اور انہی پاک و پاکیزہ ہستیوں کو خدائی علم دیا گیا ہے، اور علم کا سرچشمہ نورِ عقل ہے، چنانچہ بموجبِ حدیثِ شریف قرآنِ پاک امامؑ کے ساتھ ہے اور امامِ عالیمقامؑ قرآن کے ساتھ ہے اور یہ حقیقت تین طرح سے ہے: اوّل یہ کہ مقامِ ظاہر (یعنی اس دنیا) میں کتابِ سماوی اور امامِ برحقؑ کا باہمی رشتہ دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ مضبوط ہے، اس لئے کہ قرآنِ مقدّس پیغمبرِ خداؐ کی میراث ہے اور امامِ زمانؑ آنحضرتؐ کا وارث ہے (۴/۵۴ ، ۳۵/۴۲) دوم یہ کہ مقامِ باطن یعنی روحانیت میں روحِ قرآن (۴۲/۵۲) اور نورِ امامت (۵/۱۵) ایک ہے، اور سوم یہ کہ مقامِ عقل پر کتابِ مکنون میں قرآن اور امامؑ کا نور ایک ہے (۵۶/۷۷-۸۰)۔

سورۂ یوسف (۱۲/۲) اور سورۂ زُخرُف (۴۳/۳) میں جس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم اگرچہ ظاہراً عربی ہے، لیکن اس کی معجزاتی روح کائنات بھر کی زبانوں میں بولتی ہے، اور "لعلّکم تعقِلُون" (تاکہ تم عقلی طور پر سمجھو) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: اِنّا جعلنٰہ قُرءٰ نًا عَرَبِیًّا لَّعَلّکم تعقِلُون (۴۳/۳) تحقیق ہم نے اس کو واضح اور فصیح قرآن بنایا ہے تاکہ تم (آسانی

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سے) سمجھ لو۔ آپ اگر چاہیں تو مختلف ذرائع سے لفظ "عربیؔ" کے معنوں کی تحقیق کر سکتے ہیں، کہ عربی کے کئی معنی ہیں، مگر آیۂ مذکورہ میں اس کے معنی واضح اور فصیح کے ہیں، جس سے قرآن کا روحانی اور تاویلی پہلو مراد ہے، کہ اس میں انتہائی وضاحت و فصاحت ہوا کرتی ہے، کیونکہ اس کی تمام تر روشنی ہر کامل شخص کی مادری زبان میں ہوا کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں مرتبۂ عقل کی جس شان سے تعریف و توصیف کی گئی ہے، وہ دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ اس میں لفظِ عقل استعمال ہوا ہے، دوسری یہ کہ اس میں لفظ عقل نہیں آیا ہے، مگر وہ عقل ہی کی تعریف ہے، کیونکہ اس مقصد کے لئے عقل کے مترادفات استعمال ہوئے ہیں، اور وہ بیان غیر محدود ہے اور ان دونوں قسموں میں براہِ راست بھی اور بالواسطہ بھی عقلِ کامل کی نشاندہی کی گئی ہے، اسی طرح تمام قرآن میں نورِ عقل کا تذکرہ محیط ہے، کیونکہ قرآن ایک کامل دانا شخص کی طرح ہے، جس کے جسم پر روح محیط ہوتی ہے، اور روح پر عقل حاوی ہوا کرتی ہے، اسی طرح الفاظِ قرآن سے معانی زیادہ ہیں، اور معانی سے عقلی حکمتیں زیادہ۔

عربی ادب میں عقلِ خالص کو "لُبّ" کہتے ہیں، جس کی جمع "الباب" ہے، چنانچہ قرآنِ مقدس کے ۱۶ (سولہ) مقامات ایسے ہیں،

جہاں عظیم الشان الفاظ میں اولوالالباب (اہلِ دانش یا صاحبانِ عقل) کا ذکرِ جمیل فرمایا گیا ہے، جیساکہ ارشاد ہے: یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَاءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲/۲۶۹) خدا جس کو چاہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی تو اسے خیرِ کثیر مل جاتی ہے اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس ربّانی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمت کے ملنے سے ساری بھلائی مِل جاتی ہے اور حکمت کی وابستگی عقل سے ہے۔

اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹/۱۸) وہ لوگ جو کلام (الٰہی) کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی بہتر (سے بہتر صورت) کی پیروی کرتے ہیں یہی ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہلِ عقل ہیں۔ یہاں "اَحْسَنَهٗ" میں تنزیل کے بعد تاویل کو عمل میں لانے کا اشارہ موجود ہے، کیونکہ اولوالالباب کو عقل و دانش اور علم و حکمت اسی لئے عطا ہوئی ہے کہ انکا قول و فعل بہتر سے بہتر ہو۔

علم میں راسخ (یعنی پختہ کار) اور اولوالالباب اُئمۂ طاہرین صلوات اللہ علیہم ہیں، جیساکہ سورۂ آلِ عمران (۳/۷) میں ہے:

وما یعلم تاویلہٗ اِلّا اللہ وَ الرّٰسخون فی العلم یقولون اٰمنّا بہٖ کُلٌّ مِّنْ عند ربّنا وما یذّکّرُ اِلّآ اولوا الالباب (۳/۷) حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پختہ کار ہیں اس کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا وہ لوگ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے (یہ) سب (محکم ہو یا متشابہ) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور عقل والے ہی سمجھتے ہیں۔

سورۂ انبیاء (۲۱/۱۰۴) میں یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز خداوندِ عالم جملۂ کائنات کو اس طرح لپیٹ لے گا جس طرح لکھے ہوئے مضمون کا کاغذ لپیٹ لیا جاتا ہے۔ مگر اس میں ایک سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی کام مستقبل سے متعلق کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ اس کا ہر امر وقوع میں آچکا ہے (۳۳/۳۷) اور اس کی سُنّت جس میں خدا کا ہر ہر کام داخل ہے، اس کے خاص بندوں میں گزر چکی ہے (۴۰/۸۵) لیکن ہاں، اس کی وجہ ہے اور وہ یہ کہ یہاں خدا تعالیٰ کا فعل جس طرح صیغۂ مستقبل میں آیا ہے، وہ اللہ کی نسبت سے ہرگز نہیں بلکہ لوگوں کی نسبت سے ہے، کہ وہ اللہ کے اس کام کو جو ازل میں واقع ہو چکا ہے آگے چل کر یعنی مستقبل میں اس طرح دیکھیں گے جیسے ان کے سامنے ابھی ابھی وقوع پذیر

ہو رہا ہو۔

جب آدمی کائناتِ ظاہر کو دیکھتا ہے تو اسے آسمان و زمین کی تمام چیزیں منتشر، دور اور رسائی سے باہر نظر آتی ہیں، جب وہ اپنے آپ کو پہچاننے لگتا ہے یا جب اپنی شخصی دُنیا کا مشاہدہ کرتا ہے، تو اس وقت اس کے پیشِ نظر عالمِ صغیر میں عالمِ کبیر سمٹ کر محدود ہو جاتا ہے اور جب وہ وہاں سے عالمِ عقل کی طرف عروج کر جاتا ہے تو اُس حال میں عالمِ صغیر سراسر بصورتِ دُرِّ یتیم لپیٹ لیا جاتا ہے، مگر یہ عظیم واقعہ مادّی طور پر نہیں بلکہ روحانی، علمی اور عقلی طور پر پیش آتا ہے، کیونکہ جسمانی حال میں یہ بات قانونِ فطرت کے خلاف اور محال ہے کہ عالمِ جسمانی سُکڑ سُکڑ کر مُٹھی بھر ہو جائے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام طُوٰی کی پاک وادی میں پہنچ گئے، تو خداوندِ عالم نے فرمایا کہ اے موسیٰؑ میں تمہارا ربّ ہوں پس تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو (کیونکہ) تم اب طُوٰی کے مقدّس میدان میں ہو۔ (۲۰: ۱۲) اس کی تاویل یہ ہے کہ وہ وادیٔ عقل تھی، جس میں ان کے لئے تمام مسافتیں لپیٹ دی گئیں، اور جوتیوں کو اتارنے کا ایک اشارہ یہ ہے کہ وہاں پر روحانی سفر ختم ہو گیا، اگرچہ لفظِ طُوٰی کے معنی میں قدرے اختلاف ہے لیکن تاویلی حکمت کی روشنی میں دیکھنے سے درست اندازہ ہو

جاتا ہے کہ اس کے کون سے معنی صحیح ہیں، چنانچہ قرآنِ پاک کے چار مقامات پر مادّۂ ط و ی کے پانچ الفاظ آئے ہیں، وہ یہ ہیں: نطوی (۲۱/۱۰۴) کطیّ (۲۱/۱۰۴) طُوًی (۲۰/۱۲) طُوًی (۷۹/۱۶) مطویّات (۳۹/۶۷) پس ظاہر ہے کہ ان لفظوں کا لغوی مطلب ایک ہی ہے اور وہ لپیٹنا اور مسافتوں کو ختم کر دینا ہے، جس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ بیکران سے کائنات ظاہر و باطن کی اشیاء کے حقائق و معارف کو لُوءلُوءِ مکنون میں متحد و یکجا کر دیتا ہے، جیساکہ اس کا فرمان ہے:۔

والارضُ جمیعاً قبضتہٗ یومَ القیٰمۃِ والسّمٰوٰتُ مَطوِیّٰتٌ بیمینہٖ (۳۹/۶۷) اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ اِس نوعیّت کے ارشاداتِ ربّانی میں مرتبۂ عقلِ کامل اور مرکزِ تاویل کا ذکر ہوتا ہے، چونکہ ذاتِ سبحان ہاتھ اور جسم کے تصوّر سے پاک و برتر ہے، لہٰذا یہ کام بحکمِ خُدا وہ کامل انسان انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے افعال و اوصاف کا مظہر، اس کا خلیفہ، نورِ نبیؐ، روحِ قرآن اور ولیّ ؑ امر ہے، اور امر کا اصل مقام بھی یہی ہے۔

یہاں یہ بنیادی قانون بھی قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل بالذات نہیں، بلکہ وہ فاعل بالواسطہ ہے، کیونکہ وہ

بادشاہِ مطلق ہے، مثال کے طور پر کسی بڑے بادشاہ کی عزّت و عظمت اس بات میں نہیں کہ وہ ہر کام کو بذاتِ خود انجام دیتا ہے، بلکہ اس کے بادشاہ ہونے کے صحیح معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی سلطنت کے تمام امور اس کے حکم اور منشا کے مطابق نمائندگی یا خادمی کی صورت میں انجام پذیر ہو جاتے ہیں، مگر ہر قابلِ تعریف فعل آخر میں جاکر بادشاہ سے منسوب ہو جاتا ہے، کیونکہ ارادہ یا حکم یا منصوبہ اُسی کا تھا، اس مثال سے ان شاء اللہ تعالیٰ، مومنینِ بایقین حقیقی بادشاہ کے قانون کو سمجھ سکتے ہیں۔

حدیثِ نبویؐ کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو اپنی مخلوق کی مثال پر بنایا تاکہ خلق سے دین کی اور دین سے اس کی وحدانیّت کی دلیل لی جائے"۔ چنانچہ خلق سے دین کا استدلال یوں ہے کہ جس طرح دنیا کی کوئی قوم یا کوئی ملک کسی سربراہ، یعنی بادشاہ یا صدر وغیرہ کے سوا ترقی و کمال کے مراحل کو طے نہیں کر سکتا ہے، اسی طرح دین کی ہدایت و رہنمائی اور عروج و ارتقاء اُس کامل انسان کی موجودگی کے بغیر ناممکن ہے، جس کو خدا و رسولؐ نے دین میں امام بنایا ہو اور ایسے شخص کے پاس خدا کی طرف سے عقلِ کُلی کا نور ہونا چاہیئے کیونکہ نورِ عقل کے بغیر دینی ہدایت کا کوئی تصوّر ہی نہیں ہو سکتا، جس طرح دُنیوی عقلمندی کے سوا ظاہری حکومت چل نہیں سکتی

ہے، اس سے ظاہر ہے کہ دین میں سب سے عظیم و اعلیٰ چیز نورِ عقل ہے اور کائنات و موجوداتِ ظاہر و باطن کی تمام مادّی، روحانی، علمی اور عقلی اقدار اُس گوہرِ یکتا میں جمع ہیں، جس طرح تخمِ درخت میں درخت کی گوناگون قوتیں جمع بھی ہو جاتی ہیں اور ایک پودے کو اُگا کر اس میں پھیل بھی جاتی ہیں۔

حقیقی علم نورِ عقل کی روشنی ہے، جس کے بغیر قرآنی مثالوں کو سمجھنا محال ہے، جیساکہ سورۂ عنکبوت (۲۹/۴۳) میں ارشاد ہُوا ہے: وتلك الامثالُ نضربها للنّاسِ ج وما يعقلها الّا العٰلمون (۲۹/۴۳) اور ہم ان (قرآنی) مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں، اور ان مثالوں کو بس علم والے ہی جانتے ہیں۔ یہ ربّانی علماء ائمۂ آلِ محمدؐ ہیں، جن کی ذاتِ بابرکات میں سرچشمۂ نورِ عقل موجود ہے، یعنی ہر زمانے میں ایک طرف ناس (لوگ) ہیں، اور دوسری طرف خدا کی کتاب (قرآن) اور ربّانی عالم جو امامِ وقت ہے، جس طرح زمانۂ نبوّت میں کتابِ سماوی کے ساتھ معلمِ ربانیؐ بھی تھے، اسی طرح ہمیشہ قرآنی علم و حکمت کا وسیلہ مہیّا ہے، کیونکہ نورِ خداوندی جو نورِ عقل ہے، وہ کبھی بجھتا نہیں، وہ ہر وقت بیدریغ روشنی بکھیر رہا ہے۔

قرآنِ حکیم سرتاسر عقلی مثالوں سے مملو (بھرا ہُوا) ہے،

جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک نورِ عقل کی بلندی سے نازل ہوا ہے، وہ بلند مقام عقلی تمثیلات کا سرچشمہ ہے، اور عقل کا دوسرا نام قلمِ الٰہی ہے، چنانچہ یہ مثالیں وہی شخص کامل جانتا ہے، جس کو خداوند عالم نے عقلِ کامل کا نور عطا کر دیا ہے اور ایسا شخص زمانے کا امام ہے، جو وارثِ رسولؐ اور خلیفۂ خدا ہے۔

قرآن کی مثالوں سے متشابہات مراد ہیں، جو قرآنِ مقدّس کا مشکل ترین حصّہ ہیں، اور جو شخص مثالوں کو جانتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ممثولات کو جانتا ہے اور ممثول تاویل کا دوسرا نام ہے، چنانچہ آیۂ مذکورہ میں جس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت صاف و روشن ہو جاتی ہے کہ ائمۂ برحق صلوات اللہ علیہم قرآنی تاویل کو جانتے ہیں، اور یہ آیۂ مبارکہ "راسخون فی العلم" کی تشریح و تصدیق ہے، جیساکہ فرمایا گیا ہے: وما یعلم تاویلہٗ اِلّا اللّٰہ والرّاسخون فی العلم (۷/۳) حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پختہ کار ہیں اس کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا۔

نورِ عقل ہمیشہ عقلی حرکت میں ہے، وہ آسمانوں اور زمین کی تمام علمی مثالوں کا مظاہرہ کرتا ہے، اس معنیٰ میں وہ "اَلْمَثَلُ الْاَعْلٰی" ہے (۱۶/۶۰، ۳۰/۲۷) وہ عالمِ عقل کہلاتا ہے، جو عالمِ روحانی پر محیط ہے، اگرچہ عقلی دُنیا کا پھیلاؤ، اجزاء اور تمام چیزیں

تو ہر فرد میں جمع اور دستِ قدرت میں محدود ہیں۔ پھر بھی وہ عالمِ عقل ہی ہے، چنانچہ نہ صرف مثالیں بلکہ قرآن کی ہر ہر چیز عالمِ عقل سے آئی ہے، پس عمل تاویل کی بنیاد اسی اصول پر قائم ہے کہ نورِ عقل کی روشنی میں قرآنی حکمتوں کا مطالعہ کیا جائے۔

جس طرح جزوی عقل کا وجود عام انسان سے باہر نہیں بن سکتا، اسی طرح کُلّی عقل انسانِ کامل کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے، اور جہاں سب سے بڑی عقل کو فرشتہ کہا جاتا ہے، وہاں بھی انسانِ کامل ہی کی لطیف ہستی موجود ہے، کیونکہ انسان ہی روحانی ترقی کے بعد فرشتہ کہلاتا ہے، کیونکہ جو فرشتے نیک خیالات کی حیثیت میں ہوتے ہیں، وہ بھی انسان سے پیدا کئے جاتے ہیں، جو ملائکہ ذرّات کی طرح ہیں وہ بھی، اور جو جلالی فرشتے ہیں، وہ بھی انسانوں سے بنائے جاتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ جنّات، شیاطین اور ہر قسم کی روحیں بھی انسانوں سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کے اعمالِ نیک و بد کا وزن کیا جائے گا، اور اِس موضوع سے متعلق ایک آیۂ کریمہ یہ ہے: فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ (۷-۶:۱۰۱) پھر (وزنِ اعمال کے بعد) جس کا پلّہ بھاری ہوگا وہ حسبِ دلخواہ عیش میں ہوگا۔ لیکن سوال ہے

کہ وزن کی کیا کیفیت ہوگی؟ کیونکہ اعمال مادّی اشیاء کی طرح وزن نہیں رکھتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ بندوں کے اعمال کو ترازوئے عقل میں تولا جائے گا، جس میں بدی کا کوئی وزن نہیں ہوگا، اور نہ ہی ایسے کسی عمل میں وزن ہوگا جو علم و حکمت کے بغیر ہو، کیونکہ ساری بھلائی حکمت میں ہے (۲/۲۶۹) چنانچہ جو اعمال نورِ عقل کی روشنی میں کئے گئے ہوں، اُن میں وزن ہوگا، اور انہی سے مومنین کا پلّہ بھاری ہوگا۔

اس دنیا میں ہر دانشمند جب بھی کسی معاملے کے نفع و نقصان پر غور کرتا ہے یا کسی چیز کی بھلائی اور بُرائی پر تبصرہ کرتا ہے تو اس میں وہ عقل ہی کی ترازو یا کسوٹی (معیار) بناتا ہے، اور اسی سے افکار و خیالات کا عقلی وزن کرتا ہے۔

میزانِ عقل یا ترازوئے حقائقِ عقلی آسمان کی بلندی پر بھی ہے (۵۵/۷-۹) نیز وہ آسمانی کتاب کے ساتھ ساتھ نازل بھی ہوئی ہے، تاکہ عقل و دانش اور علم و حکمت کی چیزوں کا وزن کیا جائے، متعلقہ آیۂ مبارکہ یہ ہے: لقد ارسلنا رُسُلنا بالبیّنٰتِ وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم النّاس بالقسط (۵۷/۲۵) تحقیق ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور ترازو (ئے عقل) کو نازل کیا تاکہ لوگ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

عدل پر قائم رہیں۔ یہاں الکتاب سے اساسؑ مراد ہے، میزان کی تاویل امامِ زمانؑ ہے، جو ترازوئے عقل و عدل ہے، اور ناس (لوگ) جو اس ترازو سے کام لیتے ہیں حُجج (حُجّتان) ہیں۔

حضرت امام محمد الباقر علیہ السّلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: لمّا خلق اللّٰہ العقل استنطقہ ثمّ قال لہ: أقبل فأقبل ثمّ قال لہ: أدبر فأدبر ثمّ قال: وعزّتی وجلالی ماخلقتُ خلقاً ھُوَ احبّ إلیَّ منك ولا أکملتُك إلّا فیمن أُحِبّ، أمّا إنّی إیّاك آمر وإیّاك أنھی وإیّاك أُعاقبُ وإیّاك أُثیب۔ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اُس سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ: آگے آ، سو وہ آگے آئی، پھر ارشاد ہوا کہ: پیچھے جا، تو پیچھے گئی، پھر خدا نے ارشاد فرمایا کہ: میری عزّت و بزرگی کی قسم! کہ میں نے کوئی ایسی مخلوق نہیں بنائی جو تجھ سے بڑھ کر مجھے محبوب ہو، نہ میں تجھ کو (ہر کسی میں) مکمل کر دیتا ہوں مگر ایسے شخص میں جس کو میں محبوب رکھتا ہوں، پس میں تیرے ہی توسط سے امر کرنے والا ہوں، تیرے ہی توسط سے نہی کرنے والا ہوں، تیرے ہی توسط سے عذاب ہوگا اور تیرے ہی توسط سے ثواب ہوگا۔

اس مبارک ارشاد میں کئی اساسی سوالات کے لئے

جوابات مہیّا ہیں، مگر اس میں سوچنے کی ضرورت ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ یہ عقلِ کامل یعنی عقلِ کُلّ کا ذکر ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ انسانِ کامل سے وابستہ ہے، اس کے بغیر اُس کا کوئی کمال نہیں، اور نہ ہی عقلِ کُلّ کے لئے کوئی زمانی اوّلیّت ہے، کیونکہ حدیثِ مذکورۂ بالا میں جیسا ارشاد ہوا ہے وہ ہمیشہ کی بات ہے جو انسانِ کامل کے "عالمِ شخصی" میں ہوا کرتی ہے۔

نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی
۱۷ / جنوری ۱۹۸۴ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

قرآن میں تصوّرِ "یَدُ اللہ"

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ حضراتِ اہلِ علم اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ یَدُ اللہ یعنی دستِ خدا کا ذکر قرآنِ حکیم کی بہت سی آیات میں موجود ہے، اور اس سلسلے میں یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسی آیاتِ کریمہ جو یَدُ اللہ کے بارے میں ہیں، وہ سب کی سب مُتَشَابِھات میں سے ہیں، جن کی تاویل کے بغیر اصل مطلب واضح نہیں ہو سکتا، لیکن خداوندِ مہربان نے اہلِ بصیرت کے لئے اس حکمت آگین مثال کے ممثول (تاویل) کو بیان فرماتے ہوئے اس جیسی دوسری بہت سی مخفی حقیقتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور وہ خاص آیت جس سے ربانی تاویل کا نور جھلک رہا ہے، اور جو "یَدُ اللہ" کے قرآنی موضوع میں بنیادی اور کلیدی اہمیت کی حامل ہے، وہ درجِ ذیل ہے:-

اِنَّ الّذین یبایعونك اِنّما یبایعون اللہؕ ید اللہِ فوقَ ایدیھم (۴۸: ۱۰) اے رسولؐ) تحقیق جو

لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں سوائے اس کے نہیں کہ وہ (دراصل) اللہ سے بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ ربِّ کریم کے اس مقدّس ارشاد اور اس بے نظیر تاویل سے یہ حقیقتِ پائندہ روشن ہو جاتی ہے کہ خلیفہ اور نمائندۂ خدا کی حیثیت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دستِ مبارک نہ صرف مومنین سے ظاہری بیعت لینے میں دستِ خدا ہے بلکہ اسی قانونِ خلافت و نیابت کے مطابق آنحضرتؐ اور آپؐ کے جانشینؑ کا پاک ہاتھ ہر اُس فعل میں دستِ خدا ہے، جو ظاہراً یا باطناً خدا کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے، کیونکہ اِس مثال کے برعکس اللہ تعالیٰ کی ذات کے ہاتھ پاؤں کا کوئی تصوّر ممکن نہیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں جو اساسی حکمتوں سے مملو (بھری ہوئی) ہے "اِنَّ" حرفِ تحقیق بھی ہے اور حرفِ تاکید بھی اور "اِنَّمَا" کلمۂ حصر ہے، جس کا مفہوم و منشاء یہ ہے کہ دستِ خدا کے لئے اقرار اور اُس پر بیعت کرنے کی بس یہی ایک صورت ہے کہ نمائندۂ خدا اور ھادیٔ زمانؑ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی جائے، اور سوائے اس کے دوسرا کوئی طریقہ نہیں، یہ "اِنَّمَا" کی تاویلی حکمت ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ "بیعت" ایک دینی اصطلاح ہے، جو اطاعت د

فرمانبرداری کے عہد و پیمان کو کہا جاتا ہے، مگر اس کی "تاویل اصل لفظ میں پوشیدہ ہے اور تاویل کا اصل یہی ہے، چنانچہ بیعت کے لغوی معنی "بیع" میں محفوظ ہیں، اور وہ معنی ہیں خرید و فروخت، لین دین، بیچنا، خریدنا، سو زمانۂ نبوّت میں حضورِ انورؐ کے دستِ اقدس پر اور دورِ امامت میں امامِ زمانؑ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کرنے کی تاویل یہ ہے کہ مومنوں نے گویا جان و مال کو خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں فروخت کر دیا، اور اسی بابرکت ہاتھ کے توسّط سے جنّت کو خرید لیا، جیسا کہ اسی سلسلے میں "آیت سے آیت کی تفسیر" کے اصول پر فرمایا گیا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنّت ملے گی۔ سو یہ آیۂ مبارکہ آیۂ بیعت کی تفسیر و تاویل ہے، اور یہ اُخروی خرید و فروخت یا لین دین جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مومن بندوں کے درمیان ہُوا کرتا ہے، صرف اسی دستِ خدا کے وسیلہ سے ہو سکتا ہے، جس کے بغیر کسی شخص کا ایسا سودا نہ کبھی ہو سکتا ہے اور نہ ہی لائقِ قبول ہے اس کی عملی مثال جہاد اور زکوٰۃ ہیں، جو مذکورہ سودے کے دو ایسے نمایاں نمونے ہیں، جو پیغمبرِ خداؐ اور ولیِّ امرؑ کے

دائرۂ اِطاعت سے باہر اِن کی کوئی مقبول صورت نہیں بن سکتی ہے۔

اس بارے میں سورۂ مائدہ (۵/۶۴) کے ایک ارشاد کا ترجمہ بھی پیشِ نظر ہو، اور وہ یہ ہے: اور یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بند ہو گیا ہے ان ہی کے ہاتھ بند ہیں اور اپنے اس کہنے سے یہ رحمت سے دور کردئے گئے، بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے (۵/۶۴) اس کی تاویل یہ ہے کہ یہود نے یہ گستاخی آنحضرتؐ کی شان میں کی اور انہوں نے اپنی جہالت و نادانی اور کورِ باطنی کی وجہ سے حضورؐ کو جو دستِ خدا تھے، مفلس یعنی بے علم قرار دیا، اور اسی معنیٰ میں انہوں نے خدا کے ہاتھ کو علمی خزانوں کے خرچ کرنے سے قاصر سمجھا، جس کے نتیجے میں وہ خود جاہل اور علم کی دولت سے محروم و مفلس رہ گئے، اور سرچشمۂ رحمت سے دور ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ عالمِ روحانی میں عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ ہیں، اور عالمِ جسمانی میں ناطقؑ ا[illegible]اسؑ ہیں، اور دَورِ امامت میں یہ درجہ اساسؑ اور امامؑ کو حاصل ہے، اسی طرح خدا کے دونوں مقدس ہاتھ علم و حکمت کے عطا کر دینے میں کشادہ ہیں اور اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے اپنے مبارک ہاتھ

سے عقلی اور علمی جواہر عنایت کر دیتا ہے۔

خدا کے دونوں ہاتھ سے نورِ نبوّت اور نورِ امامت مراد ہے، جو حقیقت میں ایک ہی نور ہے، جس طرح دونوں ہاتھ فعل اور اس کے مقصد میں ایک ہوتے ہیں، کیونکہ خدائے واحد کے نور کو ایک ماننا حقیقت ہے، اور دو کہنا مجاز اور مثال ہے اگر کوئی شخص اس حکمت کو نہیں سمجھتا ہے تو اسے سخت حیرت ہو سکتی ہے، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی پاک و پُرحکمت عادت ہے، کہ وہ دانا و بینا اپنے نورِ مقدس کی حقیقت سمجھانے کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان فرماتا ہے (۱۷/۸۹، ۱۸/۵۴) جیسے ارشاد ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴/۳۵) خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مصباح (۲۴/۳۵) اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے جس میں ایک چراغ روشن ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نورِ خداوندی کائنات و موجودات پر محیط بھی ہے اور اپنی خاص جگہ پر مرکوز بھی، یہی مثال خدا کے دونوں ہاتھ کی بھی ہے کہ وہ کسی نارسائی کے بغیر کُلّی طور پر مبسوط (کھلے ۵/۶۴) ہیں، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دستِ خدا تمام اشیائے ظاہر و باطن پر بسیط و محیط ہے، پس جاننا چاہیئے کہ نورِ خدا اور دستِ خدا ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

آیۂ نور (۲۴/۳۵) کے واضح مفہوم کے مطابق یہ کہنا حقیقت ہے کہ آسمان و زمین کی جملہ اشیاء خدائی نور کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اسی امرِ واقعی کی ایک عقلی، روحانی اور عملی نمونہ یہ ہے کہ مقامِ عین الیقین پر (جس کا دوسرا نام قیامت ہے) ساری کائنات اللہ پاک کی مٹھی میں ہے (۲۱/۱۰۴، ۳۹/۶۷)

یہاں چند بڑے اہم قرآنی کُلیّات کی جانب توجہ دلانے کی خاطر یہ سوال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آیا ہر چیز امامِ مُبین میں محدود نہیں (۳۶/۱۲)؟ کیا تمام چیزیں ایک کتاب میں جمع نہیں (۷۸/۲۹)؟ کیا قرآنِ پاک میں کُلّ چیزوں کے خزائن کا تصوّر نہیں (۱۵/۲۱)؟ کیا قرآن میں یہ ارشاد نہیں کہ خدا کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے (۲/۲۵۵)؟ آیا پروردگار نے ہر ہر چیز (یعنی کائنات و موجودات) کو رحمت اور پھر علم کے گھیرے میں نہیں رکھا ہے (۴۰/۷)؟ کیا یہ ایک مسلّمہ حقیقت نہیں کہ ہر شی لوحِ محفوظ میں ہے اور خدا نے ہر چیز کو احاطۂ علم میں محدود کیا ہے۔ (۶۵/۱۲)؟

اس سوال یا اِن سوالات کا مشترکہ اور واحد جواب یہ ہے کہ ہاں، کیوں نہیں، یقیناً یہ قرآنی تعلیمات ہیں، اور ان میں ذرّہ بھر شک نہیں، مگر اس اقرار کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ اسماء و امثال جس طرح ظاہر میں الگ الگ ہیں، اسی طرح ان کے ممثولات (حقائق) بھی باطن اور مقامِ وحدت پر جدا جدا ہوں، بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ

اصل میں یہ نورِ واحد ہی ہے، جس کی بہت سی مثالیں دی گئی ہیں، جس طرح ذاتِ سبحان ایک ہے، مگر اس کے بہت سے اسماء و صفات ہیں، قرآنِ پاک ایک ہے، لیکن اس کے کئی نام ہیں اور حضورِ انورؐ کی ذاتِ بابرکات ایک تھی مگر آپؐ کے مبارک نام اور اوصاف کثیر ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ کسی شئ کے ناموں کی کثرت اس کی ذات کی وحدت کو متفرق نہیں کر سکتی ہے۔

اس مقام پر ایک اور سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن یعنی مقامِ روحانیت میں اللہ تعالیٰ جملہ کائنات کو لپیٹ کر مٹھی میں کیوں لیتا ہے اور اس میں کیا حکمت ہے؟ اس حال میں کائنات کی شکل و صورت کیا ہوگی؟ اور اجزائے عالم کے اعداد و شمار کا کیا حشر ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ عقلی اور علمی قیامت ہے، اس میں خدائی کی لاانتہا حکمتوں کا سلسلہ چلتا ہے، اس لئے کوئی شخص ان کو شمار نہیں کر سکتا، کائنات کی شکل و صورت ایک بے مثال گوہر کی سی ہوگی، جو قبضۂ قدرت میں ہوگا، اجزائے عالم اور کثیر چیزوں کے اعداد اس گوہرِ واحد میں فنا ہو جائیں گے، جیسے قولِ قرآن ہے:۔

وَ اَحۡصٰی کُلَّ شَیۡءٍ عَدَدًا (۷۲ : ۲۸) اور اُس نے ہر چیز کو شمار میں گن لیا۔ تاویل: اور خدا نے تمام چیزوں (یعنی کائنات

اور اس کی ہر چیز) کو گوہرِ واحد بنا کر گن لیا، یعنی خدائے برتر کے ہاں چیزوں کا شمار کرنا اس طرح ہے کہ وہ ان کو گوہرِ فرد میں گنتا ہے، یاد رہے کہ "اَحۡصٰی" کے اصل معنی میں گوہر کی تاویل پوشیدہ ہے۔

اس باب میں ایک اور آیۂ کریمہ یہ ہے: لَقَدۡ اَحۡصٰهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا (۱۹/۹۴) اُس نے اُن کو گھیر لیا ہے اور گن لیا ہے جیسا کہ گننا ہے۔ تاویل: تحقیق اُس نے سب کو عالمِ علوی میں گوہر بنا رکھا ہے اور ان کو اسی گوہرِ واحد میں شمار کر رکھا ہے جیسا کہ شمار کرنے کا حق ہے۔ آپ اِس پُرحکمت آیت میں سوچیں جو مذکورہ آیت سے مربوط ہے: وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا (۱۹/۹۵) اور قیامت کے روز سب کے سب اس کے پاس ایک تنہا شخص (بن کر) حاضر ہوں گے۔ جیسے ارشاد ہے: مَا خَلۡقُكُمۡ وَلَا بَعۡثُكُمۡ اِلَّا كَنَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) تم سب کا پیدا کرنا اور (مرنے کے بعد) زندہ کرنا ایسا ہے جیسا ایک شخص کا۔

پروردگارِ عالم کے مبارک ہاتھ میں جو انمول شئی ہے اس کا ایک نام فضل ہے (۳/۷۳، ۵۷/۲۹) قرآنِ حکیم میں کئی جامعِ جوامع الفاظ ہیں، اُن میں سے ایک فضل ہے، جس میں سب کچھ ہے، اسی قسم کا دوسرا لفظ خیر ہے (۳/۲۶) خیر خدا کے ہاتھ میں ہے، اس میں ساری خیرات (خوبیاں اور نیکیاں) جمع ہیں، فضل ہی کا دوسرا

نام خبیر ہے، تیسرا نام مُلک (بادشاہی ۶۷/۱) ہے، یعنی روحانی اور اُخروی سلطنت، جو خدا کے ہاتھ سے عطا کر دینے کے معنی میں ہے، چوتھا نام ملکوتِ اشیاء ہے (۳۶/۸۳)، یعنی تمام چیزوں کی عقل و جان کا عالم، جو قبضۂ قدرت میں ہے، پانچواں نام حکمت ہے، اور چھٹا نام نورِ عقل ہے، اور اسی طرح اُس گوہرِ گرانمایہ کے بے شمار نام ہیں۔

خدائے بے نیاز و برتر بادشاہ اور امر کا مالک ہے، فاعل بالذّات نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ہر وہ کام جس کا تعلق ہاتھ سے ہو اسی یدُ اللّٰہ سے انجام پاتا ہے جس کا یہاں ذکر ہوا، جیسا کہ قرآنِ مقدّس کا واضح مفہوم ہے کہ آنحضرتؐ کا مومنین سے صدقہ لینا، اللہ کا صدقہ لینا ہے (۹/۱۰۳-۱۰۴) حضورؐ کا اہلِ ایمان کو پاک و پاکیزہ کرنا خدا کا پاک و پاکیزہ کرنا ہے (۹/۱۰۳، ۲۴/۲۱) رسولؐ کی طرف سے صلوات پانا خدا اور ملائکہ کی طرف سے صلوات ہے (۹/۱۰۳، ۳۳/۴۳) آپ علیہ الصّلات والسّلام کا پھینکنا خدا کا پھینکنا ہے (۸/۱۷)، پیغمبرؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے (۴/۸۰) اور امامِ زمانؑ کی اطاعت رسولؐ اور خدا کی اطاعت ہے (۴/۵۹) اور اطاعت دین کے ہر ہر امر پر عمل کرنے کا نام ہے۔ وما توفیقی اِلاّ باللّٰہ۔

نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی

۲۴ جنوری ۱۹۸۴ء

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

قرآنی پہاڑ اور جواہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ جس طرح اس مادّی دنیا کے پہاڑوں کے سینوں میں دُنیوی جواہر پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی طرح قرآنی اور روحانی پہاڑوں کے باطن میں دینی جواہر مخفی ہوا کرتے ہیں۔ قرآنی پہاڑوں سے ایسے پہاڑ مراد ہیں جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں موجود ہے، اور وہ دراصل دین اور روحانیت کے پہاڑ ہیں، جیساکہ ارشادِ خداوندی ہے:۔

فلمّا تجلّٰی ربّهٗ للجبلِ جعلهٗ دکًّا وّخرّ موسٰی صعِقًا (۷/۱۴۳) پس جب اُس کے ربّ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی (تو تجلّی نے) اُس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ کلامِ الٰہی کا ہر ہر لفظ بہت سے معنوں پر محیط ہوتا ہے اور یہاں یہ بھی جاننا چاہیئے کہ شخصِ کامل کی روحانی زندگی تجلّیاتِ روحی و عقلی کا ایک سِلسِلہ ہوا کرتی ہے، تاہم اِن تجلّیوں کے دو مرکز ہیں، مرکزِ روح اور مرکزِ عقل، چنانچہ پہلے

نورِ خداوندی کا ظہور جبلِ روح پر ہوا اور روحِ منجمد کو ریزہ ریزہ کر دیا، اور اس کے بعد وقت آنے پر اسی نور نے جبلِ عقل کو ریزہ ریزہ کر دیا، عقل تقسیم نہیں ہوتی ہے، اس لئے اس کا ریزہ ریزہ ہو جانا یوں ہے کہ وہ واحد ہونے کے باوجود کثرت کی ہر طرح سے نمائندگی کر سکتی ہے، اور دونوں مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیحد حیرت ہوئی، اور اسی حیرت کی تشبیہہ بے ہوشی سے دی گئی ہے، آپ اس بات کو نہ بھولیں کہ قرآن نے یہاں اپنی حکیمانہ عادت کے مطابق ظہورِ روحی اور ظہورِ عقلی کا ایک ساتھ ذکر کر دیا ہے، نیز یہ بھی یاد رہے کہ جب دُنیا کے کسی پہاڑ میں زلزلہ (بھونچال) آتا ہے یا کوہِ آتش فشان پھٹ جاتا ہے، تو اس حال میں پہاڑ کے کسی حصّے کا ریزہ ریزہ ہو جانا اس کا ضائع ہو جانا ہے، اس کے برعکس روح کے پہاڑ کا ریزہ ریزہ ہو جانا باعثِ رحمت ہے، کہ اس میں مثال کے طور پر ایک روح سے سب ارواح بن جاتی ہیں، اور اسی طرح عالمِ شخصی آباد ہو جاتا ہے، اور یہی مثال جبلِ عقل کی بھی ہے، کہ ایک عقل سے تمام عقول کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔

قرآنِ پاک اس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے، کہ کوئی چیز جوڑی کے بغیر نہیں، چنانچہ ایک ظاہری پہاڑ ہے جو مثال ہے اور دوسرا باطنی پہاڑ، جو ممثول ہے، اور جس طرح ظاہر میں دو

قسم کے پہاڑ ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جن سے مُقابلۃً فائدہ کم ہے، اور دوسرے وہ جو بہت مفید ہوتے ہیں، اسی طرح باطن میں بھی دو قسم کے پہاڑ ہیں، روحی اور عقلی، اور سب جانتے ہیں کہ جسم سے روح بدرجہا بہتر ہے، اور روح سے عقل بہت اعلیٰ ہے۔

پہاڑ کی ایک تاویل حُجّت ہے، جیسے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۰ء میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے فرمایا گیا ہے کہ چار پرند لو اور ان کو اپنے پاس منگالو (اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو اس کے بعد ان کو بلاؤ وہ سب کے سب تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اس کی تاویل یوں ہے: چار مقرّب حجتوں کی مجموعی روحانیت کے توسّط سے حضرت ابراہیمؑ کا تمام جزائر کے حجتوں پر اثر انداز ہو جانا، اور ہر پہاڑ (حُجّتِ جزیرہ) کے لشکرِ ارواح کو لے کر ان چاروں کا مقامِ اصل پر حاضر ہو جانا، پس یہاں چار پرندوں سے چار مقرّب حجت مراد ہیں، اور پہاڑوں سے حُجّتانِ جزائر مراد ہیں۔

قرآنِ مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ معلّق کیا گیا تھا (۷/۱۷۱، ۲/۶۳، ۲/۹۳، ۴/۱۵۴) اس کے معنی ہیں روح اور عقل کے پہاڑ کا سر پر بلند ہو جانا، مگر اس کے لئے ضروری نہیں کہ بنی اسرائیل کے ہر فرد نے یہ باطنی معجزہ چشمِ ظاہر سے دیکھا ہو، کیونکہ

یہ واقعہ دراصل روحانیّت اور عالمِ ذرّ سے متعلّق ہے، جس میں غیر شعوری طور پر تمام بنی اسرائیل بصورتِ ذرّات موجود تھے۔

سورۂ حشر (۵۹/۲۱) میں ارشاد ہوا ہے کہ: اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے ڈر سے جھکا اور پھٹا جاتا ہے اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں (۵۹/۲۱) متصدّع کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والا، چنانچہ یہ امرِ واقعی اور حقیقت ہے کہ انسانِ کامل کے جبلِ روح اور جبلِ عقل دونوں پر نورِ قرآن کی مذکورہ مثال کا مظاہرہ ہوتا ہے، اور عملی تاویل اس کے بغیر ناممکن ہے۔

وجودِ انسانی میں ہڈیاں پہاڑوں کے مشابہ ہیں، خصوصاً سرجو جسم کا بلند ترین حصّہ ہے، عالمِ شخصی کا کوہِ طور ہے، چنانچہ ہر کامل انسان کی ہڈیاں انفرادی قیامت یعنی روحانیت میں تسبیح پڑھتی ہیں، جیسے حضرت داؤدؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جبال (پہاڑ) اور طیور (پرندے) آپ کے ساتھ مل کر تسبیح خوانی کرتے تھے، (۲۱/۷۹، ۳۴/۱۰، ۳۸/۱۸) یہاں پہاڑوں سے ہڈیاں اور پرندوں سے ارواح مراد ہیں، پس اسی عظیم الشان گونج اور ہم آہنگی کے ساتھ ذکرِ الٰہی جو اس وقت خود کار ہوتا ہے، سر کی طرف بلند ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے کہ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمام مخلوقات کے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں چھپنے کے مقامات بنائے اور تمہارے لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کُرتے بنائے جو تمہاری لڑائی سے تمہاری حفاظت کریں (۱۶/۸۱) مومن کی روح موجودہ بدن میں محدود نہیں، وہ بسیط ہونے کی وجہ سے ہر جگہ ہے، بالخصوص بارہ جزائر کے حجّتوں میں ہے جو پہاڑ ہیں، جن میں مومنین کے لئے "اَکۡنَان"، یعنی چھپنے کے مقامات ہیں، اور اسی طرح روحِ مومن کا اعلیٰ سِرا یعنی انائے عُلوی امامِ زمانؑ اور قائم القیامتؑ میں ہے، کیونکہ امامِ وقتؑ آتشِ جہالت سے بچاتا ہے اور حضرتِ قائمؑ روحانی جنگ سے محفوظ رکھتا ہے۔

سورۂ مُرسلٰت (۷۷/۲۵-۲۷) میں ہے: کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مُردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا، اور ہم نے اس میں اونچے اونچے پہاڑ (رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ) بنائے اور ہم نے تم کو میٹھا پانی پلایا (۷۷/۲۵-۲۷) زمینِ روحانیت میں دو قسم کے لوگ ہیں، بعض میں روح الایمان ہے اور بعض میں یہ روح نہیں، اور اسی طرح کچھ لوگ زندہ ہیں اور کچھ لوگ مردہ، زمین پر اونچے اونچے پہاڑوں سے بارہ جزائر کے حُجج یعنی حُجّتان مُراد ہیں، جو جسمِ لطیف میں رہتے ہیں، جو علمِ امامت کے خزائن ہیں (۱۵/۲۱)

اور علمِ امامت کا میٹھا پانی انہی زندہ پہاڑوں سے آتا ہے۔

سورۂ مومنون (۲۳/۲۰) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِلْآكِلِينَ (۲۳/۲۰) اور (اسی پانی سے) ایک (زیتون کا) درخت بھی (ہم نے پیدا کیا) جو کہ طورِ سینا میں پیدا ہوتا ہے جو اُگتا ہے تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوئے۔ طور کے لفظی معنی پہاڑ کے ہیں، اور سَیْنَآء یا سِیْنِیْن خوبصورت کے معنی میں ہے، چنانچہ طورِ سیناء کے معنی ہوئے خوبصورت پہاڑ جس سے "کوہِ گوہر" مراد ہے، جو نورِ عقل ہونے کی وجہ سے انتہائی خوبصورت ہے، اور اسی مقام پر درختِ زیتون یعنی پیکرِ نور بھی ہے، جسکے تیل یعنی کلمات میں روشنی کا مادہ اور مکمل عقلی اور علمی غذائیت موجود ہے۔

سورۂ مریم (۱۹/۵۲) میں یہ ارشاد ہے: اور ہم نے ان (یعنی موسیٰؑ) کو کوہِ طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور ہم نے ان کو راز کی باتیں کرنے کے لئے مقرب بنایا (۱۹/۵۲) یہاں لفظ "الطّور الایمن" دو معنوں کے درمیان مشترک ہے: (۱) داہنی جانب کا پہاڑ یا پہاڑ کی داہنی جانب (۲) بابرکت پہاڑ، اگرچہ اس مقام پر تین طور (پہاڑ) ایک ساتھ ہیں، یعنی ظاہری پہاڑ، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا سرِ مبارک، اور کوہِ عقل، تاہم حقیقی معنیٰ میں "داہنی جانب" کا

اطلاق ظاہری پہاڑ پر نہیں بلکہ انسانی سر پر ہوتا ہے، اسی طرح کوہِ عقل کا بابرکت ہونا حقیقت ہے اور ظاہری پہاڑ صرف ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قٓ قف وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (۵۰:۱) قسم ہے قاف (پہاڑ) کی (اور) قسم ہے قرآنِ مجید کی۔ اس آیۂ کریمہ میں ربّ العزّت کوہِ عقل کی قسم کھاتا ہے جو کوہِ قافِ باطن ہے، اور یہی قاف قلم بھی ہے، پھر لوحِ محفوظ کی قسم کھاتا ہے، جس میں قرآنِ مجید ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ۔ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵ / ۲۱-۲۲) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ قلمِ الٰہی کا دوسرا نام عقلِ کُلّ ہے اور لوحِ محفوظ سے نفسِ کُلّی مراد ہے۔

لفظ قاف کے معنی جیسے پہاڑ کے ہیں، اسی طرح یہ ایک حرف کا بھی نام ہے، اور وہ یہ ہے: "ق" اب پہاڑ اور حرفِ "ق" کے درمیان ربط و رشتہ ہونا چاہیئے، اور وہ رشتہ یہ ہے کہ کوہِ قاف یعنی کوہِ عقل کے ایک مقام پر قرآنِ حکیم کے وہ تمام الفاظ درج ہیں، جن کے آخر میں حرف "ق" آتا ہو، جیسے حق، صدق، فلق، رِقّ، زھوق، ورق، عتیق، سحیق، اسحاق، سابق وغیرہ، اور ایسے الفاظ میں انتہائی عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

مذکورہ لفظوں کی ایک مثال یہ ہے: وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ

وَزَھَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا (۸۱/۱۷) اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل نابود ہو گیا، یقیناً باطل نابود ہو جانے والا ہے۔ اِس حکمت آگین ارشاد میں آپ دیکھتے ہیں کہ لفظ حق کا آخری حرف "ق" ہے، اور دوسری طرف سے زھوق جو باطل کا ایک نام ہے، اس کا بھی آخری حرف "ق" ہے، پس اِن دونوں کے آخر میں "ق" کا آنا اِس حقیقت کا اشارہ ہے کہ حق کا "حق الیقین" ثابت ہو جانا اور باطل کا نابود ہو جانا مقامِ عقل پر ہے، جس کا مشاہدہ آج بھی ہو سکتا ہے اور کل بھی۔

دوسری مثال: الّذی خلق سبع سمٰوٰتٍ طِباقاً ؕ ماتریٰ فی خلقِ الرّحمٰنِ مِن تفٰوُتٍ (۳/۶۷) جس نے سات آسمان ایک دوسرے کے مطابق پیدا کئے آپ رحمان کی (اس) خلق میں کوئی تفاوت نہ دیکھیں گے۔ اِس آیۂ مقدسہ میں تین الفاظ ایسے ہیں، جن کے آخر میں حرفِ "ق" آیا ہے، اور اِس علامت سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ عالمِ عقل کے سات آسمان ہیں، اور وہ ساتوں ایک جیسے ہیں، اُن میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صرف ایک ہی چیز ہے، مگر اس کے سات ابداعی ظہورات سات آسمان ہیں، طباق کے معنی اوپر تلے کی بجائے مطابق اور موافق صحیح ہیں۔

عالمِ عقل کی تمثیل و تشبیہ کے لئے ایک عظیم پہاڑ اور ایک چھوٹا

سا پتھر دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں، کیونکہ وہ حقیقی مساوات اور وحدت کا مقام ہے، چنانچہ وہ مقدّس پتھر جس سے زمانۂ موسیٰؑ میں بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے کوہِ عقل ہے، اور یہ حضرت موسیٰؑ کا سب سے عظیم عقلی، علمی اور روحانی معجزہ تھا کہ آپؑ نے کوہِ عقل میں اسمِ اعظم کا عصا مار کر علم وحکمت کے بارہ درجات کے چشمے بہادیئے، یعنی آپؑ کے بارہ حجت روحانی علم کے بارہ چشمے تھے ($\frac{2}{60}$، $\frac{7}{160}$، $\frac{26}{62}$)۔

سورۂ بقرہ ($\frac{2}{74}$) میں فرمایا گیا ہے: وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ط وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ط وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ($\frac{2}{74}$) اور تحقیق پتھروں میں سے وہ بھی ہے جس سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہے جو شق ہو جاتا ہے پھر اس سے پانی نکل آتا ہے، اور ان میں سے وہ بھی ہے جو خدا کے خوف سے نیچے لڑھک آتا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں ایک ہی گوہرِ عقل کا تذکرہ تین طرح سے ہوا ہے، اوّل یہ کہ اس سے مرتبۂ حق الیقین پر بہشت کی نہریں جاری ہیں، جس میں کلمۂ باری کارفرما ہے، دوسرا یہ کہ درجۂ عین الیقین میں اس گوہر کے مظاہروں (DEMONSTRATIONS) سے روحانی علم حاصل آتا ہے، اور تیسرا یہ ہے کہ دنیائے ظاہر میں علم الیقین کے

طور پر کوہِ عقل سے ہر اُس مومن کو فائدہ ملتا رہتا ہے، جس کے دل میں خوفِ خدا ہو، اور اس درجے کے علم کی مثال ایسی ہے، جیسے جواہر کے پہاڑ سے انمول جواہر پارے لُڑھک کر نیچے آتے رہتے ہوں۔

عقل کی عالمگیر عظمت و بزرگی اور فضیلت و برتری کا کیا کہنا کہ اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنا قلم بنا کر علمِ الٰہی کا سرچشمہ قرار دیا، قرآنِ حکیم کی کُلّ تشبیہات و تمثیلات کا رُخ اسی کی طرف کر دیا، کتابِ سماوی (قرآن) میں سرتاسر عقل و خرد کے موضوع اور سُخن کو پھیلا دیا، اسی کو توحید کی شناخت کا مدار بنایا اور اسی کو معیارِ حقیقت اور میزانِ عدل ٹھہرایا، پس آسمانوں کی گردش، سورج، چاند اور ستاروں کی تابش، اور تمام انسانوں کی کوشش کا آخری ثمرہ، کائنات و موجودات کا نچوڑ، اور ہستی کے بیکران سمندر کا گوہرِ یکتا عقل ہی ہے۔

روح اور روحانیّت کی انتہائی بُلندی اور مرکزِ دانش پر خدا کی جس شانِ قدرت سے نمونۂ عقل کا ظہور ہوتا ہے، اور جس طرح اس ظہور کے تکرار سے آفرینش کی ابتدا اور انتہا کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے، اور جیسے ازل و ابد کی جگہ دائرۂ قدیم کا تصوّر ملتا ہے، اس میں لاتعداد حکمتیں پوشیدہ ہیں، جن کے احاطے سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی ہے۔

نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی

۳۱ جنوری ۱۹۸۴ء

لنڈن سے پانچ سوال

عزیزم عبدالرحمٰن کے مکتوب ۱۴ جنوری ۱۹۸۴ء کے
اُس حصّے کا ترجمہ جس میں پانچ سوال درج تھے۔

باباپا میں خوف اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں:۔

سوال نمبر۱ : عزرائیلؑ کس طرح روح قبض کرتا ہے؟

سوال نمبر۲ : مولائے روم نے اکثر حضرت یوسفؑ کا تذکرہ فرمایا ہے، آپ نے بی بی مریمؑ سے متعلق مقالہ تحریر فرمایا ہے، کیا آپ ہمیں حضرت یوسفؑ کے بارے میں بھی کچھ بتائیں گے؟

سوال نمبر۳ : .... کیا آپ اسماعیلی تصوّرِ تعلیم کے باب میں کچھ مواد فراہم کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر۴ : اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ رُوح مختلف صُوَر (صورتیں) اپنا سکتی ہے، جیسے پانی برف بھی ہو سکتا ہے، خود پانی کی شکل میں بھی ہے، اور بھاپ کی صورت میں بھی

کیا آپ وضاحت فرمائیں گے کہ روح کے جسمِ لطیف سے جسمِ کثیف میں منتقل ہونے کا عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے ؟

سوال نمبر ۵ : کیا آپ ہمیں عُروجِ رُوح کے بارے میں مزید بتائیں گے ؟ کیا یہ انسان کے لئے درجہ وار ہے ، یعنی روحِ نباتی سے روحِ ملکوتی یا مَلکی تک ؟ یہ سوال ایک خواب دیکھنے کے بعد پیدا ہوا ہے ، میں نے ایک سرسبز درخت جو کونپلوں سے مملو تھا (خواب میں) دیکھا ، میں جیسے درخت کو دیکھتا جاتا تھا ویسے اس کے شگوفوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا ، مگر اس درخت کی خصوصیت یہ تھی ، کہ اس میں ایک وقت میں صرف ایک ہی کلی اُگ سکتی تھی ، کیا یہ روحِ نباتی کے درجے میں روح کی ترقی کی مثال ہے ؟ کیا میں بعد میں روحِ حیوانی سے متعلق اِس قسم کا خواب دیکھوں گا ؟ یا میں اپنے اس مفروضہ میں غلطی پر ہوں ؟

ازراہِ کرم باپا مجھے معاف فرمائیے ، اگر میرے سوالات درست طریقے پر نہیں پوچھے گئے ہوں ، میں ان کے جوابات کے لئے جو آپ دیں گے ، دل کی گہرائی سے شکر گزار رہوں گا ۔

یہ ہیں وہ پانچ سوال جو میرے بہت ہی عزیز روحانی بھائی اور دوستِ جانی عبدالرحمن آر نے اپنے ایک پُر خلوص خط میں بھیجے تھے ، اب میں سب سے پہلے یہ چاہتا ہوں کہ خود کو خاکپائے مومنان قرار دوں اور اپنی علمی بے سروسامانی کو ظاہر کروں تاکہ

خدائے بزرگ و برتر کو میری حالتِ زار پر رحم آئے، اور اپنے نورِ مجسّم یعنی امامِ زمان ع آلِ محمدؐ کے واسطہ سے میری دست گیری فرمائے تاکہ یہ بندۂ کمترین جو انتہائی غریب ہے امامِ اقدس واطہر صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی بارگاہِ عالی سے بار بار صدقہ اور خیرات حاصل کر سکے، اور اس سعادت کے حصول کے لئے اہلِ ایمان کی دُعا چاہیئے۔

پہلے سوال کا جواب : حضرت عزرائیل علیہ السّلام بحکمِ خدا تعالیٰ ایک اسمِ اعظم کو استعمال کر کے روح کو آہستہ آہستہ قبض کر لیتا ہے، اور دوسرا اسمِ اعظم ہے جس کے ذریعہ وہ فوراً روح کو جسم سے اٹھا سکتا ہے، روح عام طور پر کسی اور راہ سے نہیں، صرف سر کے بالائی حصّے سے نکلتی ہے، خصوصی عبادت اور سفرِ روحانیت کی ایک منزلِ اعلیٰ میں عزرائیل ع کئی دن تک طرح طرح سے قبضِ روح کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے، جس میں روح کبھی تو جسم کے باقی حصّے کو چھوڑ کر سر میں مرکوز ہو جاتی ہے اور کبھی یہ چوٹی سے عالمِ بالا کی طرف اُٹھائی جاتی ہے، مگر ہر بار اس کا نچلا سِرا دماغ کی چوٹی سے لگا رہتا ہے، اور جیتے جی کبھی روح کا یہ سِرا سر سے قطعاً الگ نہیں ہو سکتا۔

عزرائیل ع ایک سردار فرشتہ ہے، جس کے تحت بہت سے ذیلی فرشتے مقرّر ہیں، جو قبضِ روح کا کام کرتے ہیں، جیسا

کہ خداوندِ عالم کا مقدّس فرمان ہے: وَالمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوٓا اَیدِیھِم ج اَخرِجُوٓا اَنفُسَکُم (۶/۹۳) اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ ہاں اپنی جانیں نکالو۔ فرشتوں کے ہاتھوں سے ان کا ذکر و تسبیح مراد ہے، کیونکہ ملائکہ جسم نہیں ہیں، لہٰذا ان کے ہاتھ انسانوں کے ہاتھوں کی طرح نہیں، اور نہ ظاہری پرندوں کی طرح ان کے بازو ہیں، وہ روح ہیں، ان کا پکڑنا اور پرواز کرنا خدا تعالیٰ کے مختلف ناموں سے ہے، ویسے بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ روح کوئی مادّی قسم کی شئی نہیں کہ اس کو ظاہری ہاتھ سے پکڑا جائے، وہ ایک بسیط طاقت ہے، اس لئے اس پر کنٹرول صرف نامِ خدا ہی سے ہو سکتا ہے، چنانچہ عزرائیلؑ کو جس کی روح قبض کر لینے کا حکم ملا ہو اس کے بائیں کان میں آ کر اللہ کے ایک بزرگ اسم کا ذکر کرتا رہتا ہے، جس سے روح جسم کو چھوڑ کر سر میں مرکوز ہو جاتی ہے اور فرشتے اسے ذکر ہی کے گھیرے میں وہاں لے جاتے ہیں جہاں لے جانا چاہیئے۔

دوسرے سوال کا جواب: میرے بہت ہی عزیز دوست! آپ نے جس خلوص و اعتماد سے حضرت یوسف علیہ السّلام کے باب میں سوال اٹھایا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ سے متعلق ایک مقالہ لکھا جائے، اور اگر یہ کام ممکن ہوا تو اس تحریر سے الگ ہونا چاہیے، تاہم یہ وعدہ نہیں، یہاں اس سلسلے میں

صرف چند نکات بیان کئے جاتے ہیں :-

حضرت یوسف علیہ السّلام اپنے وقت میں امامِ مستودع تھے، آپؑ نے ابتداء میں ایک نورانی خواب دیکھا تھا، جسمیں گیارہ ستارے، سورج اور چاند آپؑ کو سجدہ کر رہے تھے، جس کی تاویل یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ جو اس وقت بارھواں ستارہ تھے، آگے چل کر اپنے والدِ محترم حضرت یعقوب علیہ السّلام کی جگہ پر امام بننے والے تھے، چنانچہ وقت آنے پر برادرانِ یوسفؑ نے جو گیارہ حُجّت تھے، آپ یعنی یوسفؑ کی اطاعت کی، اور گیارہ ستاروں کے سجدہ کرنے کی یہی تاویل ہے، پھر سورج نے سجدہ کیا، یعنی حضرت یعقوبؑ نے بحکمِ خدا امامت حضرت یوسفؑ کے سپرد کر دی، اور نور جو اُس وقت بیٹے میں آچکا تھا، اس کی اطاعت کرنے لگا، اور سب سے آخر میں چاند نے سجدہ کیا، یعنی حُجّتِ اعظم (باب) نے امامِ سابق کی آخری حد تک پیروی کر کے عملِ تفویض کے بعد جانشین امام (حضرت یوسفؑ) کی اطاعت کی، آپ آیۂ کریمہ ($\frac{12}{4}$) میں یہ ترتیب دیکھ سکتے ہیں کہ پہلے گیارہ ستاروں کا ذکر ہے، پھر سورج کا اور آخر میں چاند کے سجدہ کرنے کا تذکرہ ہے۔

جب ہم سورۂ یوسف کی آیت ۹۹ سے بغور آیت ۱۰۲ میں جاکر دیکھتے ہیں تو مفہوم ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

انسانِ کامل کی برگزیدگی یہی ہے، اسی طرح علمِ تاویل عطا ہوتا ہے، اور اسی صورت میں خدا کی ہر ہر نعمت بدرجۂ تمام حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ بات روحِ قرآن کے مطابق ایک روشن حقیقت ہے کہ پروردگارِ عالم نے ہر پیغمبر اور ہر امام کو علمِ تاویل کے خزانوں کا مالک بنا دیا ہے، اور اس امرِ واقعی کی مثال حضرت یوسفؑ ہیں، کیونکہ آپؑ پیغمبر بھی ہیں اور امام بھی، اور تاویل کوئی ظاہری چیز نہیں ہوتی، بلکہ یہ آسمانی کتاب کی روحِ اعظم اور اس کی عالمگیر روحانیت کا نام ہے، یہی وہ عظیم الشان روح ہے، جو کبھی تو روح الارواح کہلاتی ہے، کبھی نفسِ کُلّی، اور کبھی لوحِ محفوظ، غرض اس میں کتابی اور درسی تاویل کا ذکر نہیں بلکہ نورانیت سے بھرپور تاویل کا ذکر ہے، جو حقیقی نور اور کتابِ ناطق ہے، جس میں ہر چیز کا ذرّۂ لطیف، تمام اشیاء کی ارواح، اور جملہ عقول محدود ہیں۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ بارہ حُجّت تو سیّارۂ زمین کے بارہ مختلف جزیروں میں ہُوا کرتے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے اپنے گھر بیٹھے ہوئے اُن بارہ جزیروں کے حُجّت قرار پائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدودِ دین کا اصل نظام جسمِ لطیف میں ہوا کرتا ہے، کیونکہ جس طرح جنّات یعنی پریوں

کا وجود جسمِ لطیف میں ہوتا ہے، جن میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی، اسی طرح جُتّانِ شب و روز اجسامِ لطیفہ کے واسطہ سے اپنے اپنے جزائر میں کام کرتے ہیں۔

<u>تیسرے سوال کا جواب</u>: اس سوال کا جواب بھی ایک مفصّل اور مکمل مقالے کی صورت میں دیا جا سکتا ہے، تاہم آپ کی دلچسپی کے لئے چند باتیں ضروری ہیں، کہ اسماعیلی تصوّرِ تعلیم دراصل اسلامی تصوّرِ تعلیم ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے، لہٰذا ہمارا یہ تصوّر اپنی حقیقی شکل میں ایک جانب سے قرآن اور روحانیّت کے ساتھ ہم آہنگی رکھتا ہے اور دوسری جانب سے زمان و مکان کے تقاضوں کو قبول کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ دینی تعلیم روحانی حکمتوں سے بھرپور ہونی چاہیئے، اور دنیوی تعلیم جدید اصولوں کی روشنی میں ہونی چاہیئے، کیونکہ علم کا مقصد فرد اور قوم کی روحانی اور مادّی صلاح و فلاح ہے، اور اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو تعلیم بے معنی ہو جاتی ہے۔

نئی نسل کی دنیوی تعلیم کس طرح ہونا چاہیئے، یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں، کیونکہ آئے دن اس کے نت نئے طریقے اور زیادہ سے زیادہ مفید اصولات بنتے رہیں گے، جبکہ اقوامِ عالم کی مجموعی کوشش اسی میں لگی ہوئی ہے تاکہ وہ سائنس سے فائدہ اٹھا کر سکھانے اور سیکھنے کے طرز کو بہتر سے بہتر بنا سکیں، مگر مسئلہ

دینی اور روحانی تعلیم کا ہے، اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس میں ذیلی طور پر ہزاروں مسائل ہیں، پھر بھی اسماعیلیوں کے پاس ایک ایسا بیمثال وسیلہ موجود ہے، جس کی ذاتِ بابرکات کے سامنے مسائل کیا مشکلات بھی حل ہو سکتی ہیں، مگر ہمیں اس سلسلے میں ٹھیک طرح سے سوچنے، جاننے اور پھر ہمّت سے کام لینے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم وسیلۂ نور سے مکمل فائدہ حاصل کرسکیں۔

اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۲۴/۳۵) اس کے یہ معنی ہیں کہ کائنات و موجودات میں کوئی چیز ایسی نہیں، جس کو اس نور سے درجہ وار اور ضروری روشنی خود بخود نہ ملتی ہو، مثلاً جمادات، نباتات، حیوانات اور فرشتوں کو یہ روشنی ہمیشہ ان کے درجہ اور ضرورت کے مطابق خود از خود ملتی رہتی ہے، مگر انسان کا معاملہ اختیار کی وجہ سے سب سے مختلف ہے، لہٰذا اسے جس اعلیٰ عقلی، علمی اور روحانی نور کی ضرورت ہے، وہ نہیں ملتا ہے، مگر خدا اور رسولؐ اور ولیٔ امرؑ کی اطاعت سے، پس اسماعیلی مذہب میں قرآنی اور روحانی علم کا دروازہ ہر وقت کشادہ ہے۔

چوتھے سوال کا جواب: جی ہاں، روح مختلف شکلیں اپنا سکتی ہے، اور جسمِ لطیف سے جسمِ کثیف میں اس کی منتقلی کی مثال یوں ہے، کہ تصوّرِ آفرینش خط یعنی لکیر (ـــــ) کی طرح نہیں، بلکہ دائرے (○) کی طرح ہے، جس کا

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

مطلب یہ ہے کہ آفرینش کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، بس یہ ایک قدیم دائرہ ہے، جو کسی طرح بھی حادث نہیں، جس کی مثالیں اس دنیا میں بہت ہیں، جیسے آسمان، ہر سیارہ، ہوا، پانی، نبات اور حیوان میں سے ہر ایک کا ایک دائرے پر ہمیشہ گردش کرتے رہنا، جیسے گٹھلی (بیج) سے درخت اور درخت سے گٹھلی کا پیدا ہو جانا، جس میں نہ تو درخت پہلے ہے اور نہ بیج بلکہ دونوں بغیر سرے کے دائرے پر واقع ہیں، اسی طرح مرغی سے انڈے کا پیدا ہو جانا اور انڈے سے مرغی کا وجود میں آنا، نیز انسان کا ماں باپ سے جنم لینا، اور پھر ماں باپ بن جانا وغیرہ، اس بیان سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ہر چیز اپنے دائرے پر گردش کرتی رہتی ہے، اور تمام ذیلی دائرے دائرۂ اعظم پر واقع ہیں، جیسے آسمان کا عظیم دائرہ اپنے اندر کے جملہ دائروں کو لے کر گردش کر رہا ہے۔

قرآنِ مقدّس کی ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ ہم کتابِ کائنات کی آیات میں عقل و دانش سے غور و فکر کریں، تاکہ ان کی حکمتوں سے قانونِ فطرت کے پوشیدہ اسرار کو سمجھ سکیں، چنانچہ ہم بعض کیڑوں مکوڑوں کو دیکھتے ہیں، کہ ان میں روح کے عروج و نزول کی مثال موجود ہے، اس سلسلے میں ریشم کا کیڑا قابلِ ذکر ہے کہ وہ تتلی یا پروانے سے بنتا ہے، پھر پروانہ بن جاتا ہے،

ہر چند کہ پروانے کی زندگی کیڑے کی زندگی سے برتر اور بہتر ہے لیکن پروانہ ریشم نہیں بنا سکتا ہے، یہ تو کیڑے ہی کا کام ہے، لہٰذا ریشم جیسی گرانقدر چیز کو پیدا کر دینے کی خاطر اسے ایک طرح سے بار بار کیڑے کے روپ میں آنا چاہیئے، ظاہر بات ہے کہ پروانہ بذاتِ خود کیڑے کی صورت میں نزول نہیں کرتا، مگر نمائندگی کے معنی میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کا دائرۂ عروج و نزول کی شکل میں واقع ہے، جیسے درخت، انسانی جسم وغیرہ کہ وہ بھی نمائندگی کی صورت میں گردش کرتے ہیں۔

اگر ارواح و ملائکہ اور اجسامِ لطیف کی تشبیہ ایسے پروانوں سے دی جائے جو بفرضِ محال کبھی نہ مرتے ہوں، اور انسانوں کی تمثیل ریشم کے کیڑوں سے دی جائے، تو بڑی صفائی کے ساتھ جسمِ لطیف سے جسمِ کثیف میں روح کی منتقلی کی مثال روشن ہو جائے گی، آپ اچھی طرح غور کر سکتے ہیں کہ یہ بات عقیدۂ تناسخ کے برعکس اور اس کی آلائش سے پاک ہے، کیونکہ اصل روح کا سرچشمہ بقولِ قرآن (۱۷/۸۵) کلمۂ کُن سے وابستہ ہے، وہ وہاں سے کبھی الگ نہیں ہو سکتی ہے اور نہ اپنے مقام کو چھوڑ کر کسی وقت اس مادّی دُنیا میں آ سکتی ہے، مگر ہاں، یہ حقیقت ہے کہ اس کے بہت سے زندہ عکس (یعنی تصویریں) لطیف اور کثیف اجسام میں پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ہماری یہ ہستی ہماری روحِ

علوی کا ایک زندہ سایہ ہے، پس یہ سایہ بار بار آتا جاتا رہتا ہے مگر مرکزِ روح عالمِ امر میں اپنی جگہ پر قائم ہے، جیسے سورج ہمیشہ کے لئے کائنات کے وسط میں ٹھہرا ہوا ہے، وہ اپنی جگہ کو نہیں چھوڑ سکتا، اور سطحِ زمین پر صرف اس کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، سورج کی شعاعوں کی پذیرائی میں تمام چیزیں یکساں نہیں ہو سکتیں، صرف آئینہ یا صاف شفاف پانی جیسی چیزوں میں سورج کا عکس بن جاتا ہے، یہ انسانی روح کی مثال ہے، سورج سرچشمۂ روح کی مثال ہے، عکس ذیلی روح ہے، اور آئینہ جسم ہے۔

جسمِ لطیف سے جسمِ کثیف میں روح کی منتقلی کی مثال فلم (FILM) سے بھی دی جا سکتی ہے، یعنی جب کسی آدمی کا فلم لے کر پکچر (PICTURE) دکھائی جاتی ہے، تو اس سے اُس شخص کی ایک ثانوی ہستی بن جاتی ہے، بغیر اس کے کہ اصل ہستی میں کوئی کمی واقع ہو جائے، اگر اس چلنے پھرنے والی تصویر میں جان اور عقل ہوتی، تو اُس شخص کو پہچان سکتی، جس سے یہ بنائی گئی ہے، اور دُور ہو گئی ہے۔

<u>پانچویں سوال کا جواب</u>: آپ کا یہ سوال جو عروجِ روح سے متعلق ہے، اگر رُوحِ علوی کے بارے میں ہوتا تو میں کسی تاخیر کے بغیر جواب دیتا کہ وہ ہمیشہ عروج کے انتہائی مقام پر رہے، اور اس کا کبھی نزول ہی نہیں ہوا، جیسے یہاں

اس حقیقت کی مثال سورج سے دی گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ آپ نے روحِ سفلی کی بابت پوچھا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا ہے، کہ عروج کا حقیقی تصوّر کیا ہے؟ آیا یہ بھی تصوّرِ آفرینش کی طرح ایک دائرے پر واقع ہے؟ یا عمُودی شکل کا ہے؟ میں تو یہاں یہ عرض کروں گا کہ عروج وارتقاء عمودی صورت میں نہیں، بلکہ دائرے کی شکل میں ہے، اور تصوّرِ آفرینش ہی تصوّرِ عروج ہے، جیسے قرآنِ مقدس کا ارشاد ہے :-

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۴۰) اور یہی ایّام ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔ یہ آیۂ حکمت آگین دائرۂ عروج و نزول اور اللہ کی عادت سے متعلق ہے، اس میں نہ صرف عالمِ ظاہر کی گردشِ زمانہ اور اقوام کے عروج و زوال کا ذکر ہے بلکہ زبانِ حکمت میں خدا تعالیٰ کے اُن عظیم دنوں کے بہت سے ادوار کا بھی تذکرہ ہے، جن میں سے ہر ایک کی مقدار پچاس ہزار (۵۰۰۰۰[1]) سال کی ہے (۷۰/۴) اور ایسے ایک دن میں کوئی کامل روح (نفسِ واحدہ ۳۱/۲۸) ارواح و ملائکہ کی عقل و جان بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور عروج کر جاتی ہے (۷۰/۴) جیسا کہ عروج وانبعاث کا حق ہے۔

---

[1] اس حساب سے ایک ہفتہ ۳۵۰۰۰۰ کا ہوتا ہے اور ایک سال ۱۸۰۰۰۰۰۰ دنیوی برس کا۔

عروجِ روح کے بارے میں اس جہان کی وحدت وسالمیّت کے نظام کو بھی جاننا ضروری ہے، اور وہ اس طرح ہے کہ جمادات کی جان نباتات ہیں، نباتات کی جان حیوانات، حیوانات کی جان عام انسان ہیں، عام انسانوں کی جان خاص انسان ہیں، اور خاص انسانوں کی عقل و جان انسانِ کامل ہے، جس کے عملی عروج میں ہر چیز بحدِّ قوّت عروج پر ہے اور بالفعل اس بلندی تک پہنچنے کے لئے جماد کو نبات میں فنا ہو جانا چاہیئے، نبات کو حیوان میں مٹ جانا چاہیئے، حیوان انسان کے لئے قربان ہو جائے، اور ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ انسانِ کامل کی اطاعت کرے، جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے، تاکہ اپنی اصل انا کو پائے۔

آپ کا خواب نورانی تھا اور اس میں روحانی ترّقی کی بشارت تھی، جس میں یقیناً آپ نے بصورتِ درخت روحِ نباتی کا مشاہدہ کیا، درخت پر بہت سے شگوفوں کی تاویل ہے روحِ نباتی کی کاپیاں (COPIES)، اُن میں ایک کُلی مرکزی یا اصلی روحِ نباتی کو ظاہر کرتی تھی، جس طرح ہم نے کتابِ روح میں لکھا ہے کہ نباتی حیوانی اور انسانی روح میں سے ہر ایک میں اپنی قسم کی بے شمار روحیں ہوا کرتی ہیں، سو اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ روحِ نباتی میں عالمِ نباتات پوشیدہ ہے، روحِ حیوانی میں عالمِ حیوان مخفی ہے، اور روحِ انسانی میں عالمِ انسان مستور ہے، لٰہذا ہر درجے کی روح کے

ساتھ اُس کی نوعیّت کی لاتعداد روحیں موجود ہوتی ہیں۔

میری اُمیّد بھی ہے اور عاجزانہ دعا بھی ہے کہ آپ ان شاء اللہ اس کے بعد نہ صرف روحِ حیوانی کا مشاہدہ کریں گے، بلکہ اپنی انتہائی عاجزی، امام کی پُر حکمت محبّت اور جماعت کی علمی خدمت جیسی عظیم عبادت کے نتیجے میں اپنی روح کی شناخت بھی حاصل کریں گے، تاکہ ہم سب مل کر امامِ اقدس و اطہر کے نورِ علم کو دُنیا بھر میں پھیلائیں، آمین!

نصیرُ الدّین نصیؔر ہونزائی

۱۴ر فروری ۱۹۸۴ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سورۂ ماعون کی تاویل

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ۔ أرأیتَ الّذی یُکذّبُ بالدّین ۔ فذٰلکَ الّذی یدُعّ الیتیم ۔ ولا یحُضّ علٰی طعامِ المسکین ۔ فویلٌ للمُصلّین الّذین ھُم عن صلٰوتِھم ساھُون ۔ الّذین ھُم یُرآءون ویمنعون الماعُون (۱۰۷:۱تا۷)

ترجمہ: خدا کے نام سے (شروع کرتا ہوں)، جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔ کیا تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے یہ تو وہی (کمبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کی ترغیب نہیں دیتا، تو اُن نمازیوں کی تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں جو دکھانے کے واسطے کرتے ہیں اور زکات نہیں دیتے ۔

تاویل: روزِ جزا یعنی قیامت حضرت قائم صلوٰت اللہ علیہ سے وابستہ ہے، چنانچہ قائم القیامت سے انکار کرنا روزِ جزا

کو جھٹلاتا ہے، اور جو شخص اسی طرح قیامت کو جھٹلاتا ہو، وہ امامِ عالیمقامؑ کو جو دُرِّ یتیم (یعنی گوہرِ یکتا) ہے دھکّے دیتا ہے، جب کہ امام نورِ علم کی صورت میں اس کے ظاہر و باطن پر طلوع ہو جانے لگتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے شخص میں حُجّت (مسکین) کی روحانی غذا کا شوق بھی پیدا نہیں ہو سکتا، کہ وہ خود بھی اِس کو کھائے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے، پس بربادی ہے اُن نمازیوں کی جو اپنی نماز کے آداب و اجزا کی تاویلی حکمتوں سے غافل ہیں، جو دکھانے کے لئے کرتے ہیں، یعنی نماز کے باطن کو نہیں سمجھتے ہیں اور زکات نہیں دیتے، یعنی عقلی اور روحانی طور پر پاک نہیں ہو سکتے۔

یتیم کی تاویل امامِ برحق ہے، کیونکہ امامؑ ہی دُرِّ یتیم یعنی گوہرِ منفرد و یکتا ہے، جبکہ یتیم کے معنی ہیں: اکیلا، لاثانی، بے نظیر۔ دُرَّۃٌ یَتِیۡمَۃٌ کے معنی ہیں: قیمتی یا بے نظیر موتی۔

مسکین کی تاویل ہے حُجّت، جس کے علم میں مومنین کے لئے تسکین ہے، اور طعامِ مسکین سے حجّت کا علم مراد ہے، جو عقلی اور روحانی غذا ہے، نیز مسکین کا مطلب یہ بھی ہے کہ حُجّت ہمیشہ امامِ اقدس و اطہرؑ کے مبارک در پر بھیک مانگتا رہتا ہے، اِس صورت میں مسکین کے کھانے کی ترغیب دینا یہ ہے کہ کوئی مومن محبّت اور عشق سے امام کی اطاعت کرے، تاکہ اس کی روح کو جو ایک طرح کی

مسکین ہے عقلی اور روحانی غذا ملے۔

اس حکمت آگین سورت کے منفی اور مثبت دو پہلو ہیں، اور مثبت پہلو یہ ہے کہ امامِ وقتؑ کی روحانیت اور مرتبۂ قائم القیامت کے لئے اقرار کر لیا جائے، تاکہ دُرِّ یتیم ایسے مومن کے باطن میں داخل ہو سکے اور مومن حجّت کے علم کی دولت سے مالا مال ہو جائے، تاکہ اس کی نماز عملی اور حقیقی ہو، یعنی وہ نماز کی حکمتوں سے باخبر ہو، اور پھر وہ پاکیزہ ہو کر علمی زکات دیتا رہے، یہ ہے سورۂ ماعون کی مربوط حکمت، بفضلہٖ وَمَنّہٖ۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۸ رمارچ ۱۹۸۴ء

اُمّ الکتاب کی حکمت

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم۔ یمحوا اللہُ مایشاءُ وَیُثبِتُ وعِندَہٗ اُمُّ الکِتٰبِ (۱۳/۳۹) خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس اصل کتاب (لوحِ محفوظ یعنی نورِ امامت) موجود ہے۔

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: حٰمٓ۔ وَالکِتٰبِ المُبِین۔ اِنّا جعلنٰہُ قُرءٰناً عَرَبِیّاً لَّعَلَّکُم تعقِلُون۔ وَاِنَّہٗ فِی اُمِّ الکِتٰبِ لدینا لعلیٌّ حکیم (۴۳/۱-۴) حٰم۔ بولنے والی کتاب کی قسم ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو اور بے شک یہ (قرآن) اصلی کتاب (لوحِ محفوظ یعنی نورِ امامت) میں ہمارے پاس بڑا عالیشان اور حکمت آگین ہے۔

پہلی آیت کے تاویلی اسرار: قرآنی موضوعات کی عرفانی کلیدیں ہوا کرتی ہیں، اور ایسی ہی کنجیاں الگ الگ بزرگ آیات کی بھی ہوتی ہیں، چنانچہ

"اُمّ الکتاب" کی شناخت نہ صرف مذکورۂ بالا متعلّقہ آیتوں کے مفاہیم کے لئے ضروری ہے بلکہ اِس معرفت سے قرآنِ مقدّس کی گہری حکمتوں کا ایک بہت بڑا دروازہ بھی کھُل جاتا ہے، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ اُم الکتاب کیا ہے، امّ الکتاب کے جتنے اصل لغوی معنی ہیں وہ سب درست ہیں اور ان تمام معنوں کا مرکز ایک ہی ہے، وہ ہے لوحِ محفوظ (۸۶/۲۲) جس کے کئی نام ہیں، جیسے امامِ مبین (۳۶/۱۲) کتابِ مکنون (۵۶/۷۸) صُحُفِ مُکرّمہ (۸۰/۱۳) وغیرہ، مگر اہلِ معرفت پہچانتے ہیں اور اہلِ دانش جانتے ہیں کہ اُمّ الکتاب اور لوحِ محفوظ ایک زندہ اور گویندہ نور ہے، کیونکہ اُمّ الکتاب کی جو نشانی اور علامت ہے، وہ اسی کے لئے خاص ہے، اور کسی دوسری چیز میں یہ خصوصیّت نہیں، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی عندیّت و نزدیکی، جو صرف انسانِ کامل ہی کو حاصل ہے، اور اِس قربِ خاص کی وجہ خدا کی خصوصی رحمت و عنایت ہے کہ اُس نے پیغمبرِ اکرمؐ کے نور کو قلم کا درجہ دیا، اور امامِ عالیمقامؑ کے نور کو لوح قرار دیا، اس تصوّر کے سوا بیجان اور بے عقل چیزوں میں سے کسی شئی کو قلم اور لوح کے معنی میں ربِّ عزّت کے قریب ماننا درست نہیں، کیونکہ قربِ خداوندی کا مطلب عقلی اور روحانی ہے، اور اس کا اطلاق شخصِ کامل پر ہوتا ہے، اس لئے کہ وہی سب سے کامل عقل اور پاک و پاکیزہ روح رکھتا ہے، اس کے برعکس اگر قربِ الٰہی کا درجہ مادّی چیزوں کو حاصل ہوتا تو پھر سونا، چاندی اور

جواہر بے جان و بے عقل ہونے کے باوجود محض مادّی خوبیوں کی وجہ سے اشرف المخلوقات کہلاتے، مگر سب دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے جب یہ ایک حقیقت ہے کہ کائنات و موجودات کی ہر چیز سے انسان اشرف ہے، تو اس میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صرف انسان ہی اسی شرافت و فضیلت کے سبب سے اللہ پاک سے نزدیک تر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، جبکہ بیجان اور بے عقل چیزیں (مخلوقات) یکسر اس سعادت سے محروم ہیں۔

اس بیان سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ نورِ نبوّت عالمِ لامکان میں قلمِ الٰہی کے مرتبے میں کام کرتا ہے، اور نورِ امامت لوحِ محفوظ کا درجہ رکھتا ہے، جس کا دوسرا نام "اُمّ الکتاب" ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے: "اُمّ الکتاب بظاہر سورۂ فاتحہ کا نام ہے، اور بباطن مرتضیٰ علی علیہ السّلام ہے، کیونکہ کتاب سے أئمہ مراد ہیں اور روحانی تولید کے اعتبار سے اساسؑ اماموں کی ماں ہے اور ناطقؑ اُن کا باپ ہے"۔[1]

اس مقام پر عقل پوچھتی ہے کہ اُمّ الکتاب سے ہر آسمانی کتاب کا جو رشتہ ہے وہ تو ظاہر ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ اُمّ الکتاب کے ساتھ صحیفۂ کائنات اور کتابِ نفس کا کیا رشتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امّ الکتاب جہاں نفسِ کُلّی ہے، وہاں یہ حقیقت روشن

---

[1] : بحوالۂ کتابِ وجہِ دین گفتار ۱۹ آخری حصہ (حکایت)

ہے کہ کتابِ کائنات اور کتابِ ذات (روح) بھی اُسی اصل سے ہیں اور خدا کے کسی چیز کو مٹانے کا تعلق ان تینوں کتابوں سے ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ اس مادّی کائنات کے ستاروں کو مٹاتا اور بناتا رہا ہے، وہ انسان کو بھی مٹاتا اور بناتا ہے، اور اگر ہم اس بات کے بھی قائل ہو جائیں کہ ہمارے دورِ عظیم کے آدمؑ سے قبل بھی بہت سے آدموں کے ادوار گزر گئے ہیں تو اِس تصوّر کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے اپنے اس قانون کے مطابق اُن لاتعداد ادوار کی مادیّت کو مٹا دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ($\frac{۵۵}{۲۶-۲۷}$)

دوسری آیت کے تاویلی اسرار: حٰمٓ: ح = ۸، م = ۴۰

جمع ۴۸، جسکے ۴ عقد ہوئے اور ۸ باقی رہے اور اس کی تاویل ہے: چار اصل یعنی عقلِ کلّ، نفسِ کلّ، ناطقؑ اور اساسؑ سات امامؑ اور خلیفۂ حضرت قائم علیہ السلام، ان حدود کی قسم اور کتابِ ناطق (نور) کی قسم کہ ہم نے کتابِ روحانیت کو عجمی نہیں بلکہ عربی (یعنی تمہاری اپنی زبان میں) قرآن بنایا تاکہ تم اسے بآسانی سمجھ سکو، اور یقیناً وہ ہمارے پاس مرتبۂ اساسیت میں عالی مرتبہ اور پُرحکمت ہے، دوسرے لفظوں میں وہ علی اور حکیم ہے۔

کتابِ مبین کا ایک خاص ترجمہ "بولنے والی کتاب" درست ہے، اس کی دلیل کے لئے سورۂ زُخرُف (۴۳) کی آیت ۲۹ کو دیکھئے، اور اسی بنیاد پر یہ بھی درست ہے کہ امامِ مبین ($\frac{۳۶}{۱۲}$) کا ایک مطلب ہے بولنے والا، یعنی تاویل کرنے والا امام، کیونکہ تمام چیزیں دائرۂ تنزیل میں نہیں سماتی ہیں، بلکہ تاویل کی وسعتوں میں جملہ اشیائے عقلی و روحانی محدود ہو جاتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا پاک فرمان ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ($\frac{۷۵}{۱۹}$) پھر اس کا بیان (یعنی تاویل) کرنا ہمارے ذمّہ ہے۔ آپ ذرا غور سے اِس آیۂ کریمہ کے ماقبل کو بھی دیکھئے کہ اس میں قرآن کے پڑھنے (یعنی تنزیل) کا ذکر ہے اور پھر "بیانِ قرآن" کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اِس سلسلے میں دوسری بڑی حکمت یہ ہے کہ خدائے حکیم نے جس طرح قرآنِ مقدّس کی تنزیل اور پڑھ کر سُنانا حضورِ اکرمؐ کے ذمّہ ٹھہرایا ہے، اس طرح بیان کو آپؐ سے وابستہ نہیں فرمایا بلکہ آئندہ بیان کی ذمّہ داری خدا نے خود لے لی، اور فرمایا کہ تاویل آنے والی ہے (مفہوم $\frac{۷}{۵۳}$) سو اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضراتِ ائمّہؑ ہی خدا و رسولؐ کی طرف سے تاویل کا کام کرنے والے تھے۔

یہ امرِ واقعی قرآنِ حکیم کے زبردست معجزات میں سے ہے کہ اس کی حیثیت جہاں مُصحَف میں ہے وہاں وہ عربی میں ہے، جیسے صحیفۂ کائنات میں ہے، ویسے تخلیق اور صنّاعی تحریروں میں ہے،

لوحِ محفوظ میں ہے تو روحانی نوشتوں میں ہے، امرِ کُنْ میں "کلمۂ جامع الجوامع" میں ہے، قلمِ الٰہی میں عقلی حرکتوں میں ہے، کلماتِ تامّات میں ہمہ رس معنوں میں ہے، اسمِ اعظم میں نورِ ذکر میں ہے، سابقہ آسمانی کتب کی روح و روحانیت میں ہے، اور جہاں یہ علمی تاویل کی صورت میں ہوتا ہے، وہاں لازمی طور پر روحانی کیفیت اور انفرادی زبان میں ہوتا ہے، کیونکہ قرآن خود زبانِ حکمت سے کہتا ہے کہ اس کی تاویلی روح و روحانیت کسی بھی مومن کے لئے غیر زبان (عجمی) نہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کے حضور میں قرآنِ پاک اور مولا علیؑ کا یہ رشتۂ وحدت نہ ہوتا تو آنحضرتؐ یہ نہ فرماتے کہ: "قرآن علی کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ۔" اور نہ آپؐ حدیثِ ثقلین کے ارشاد سے ائمّۂ اہلِ بیت کو قرآن سے وابستہ کر کے اپنے جانشین قرار دیتے، اس سے ظاہر ہے کہ قرآن اور امام ظاہراً و باطناً ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

خدا کی خدائی میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں، وہ تین قسم کی ہیں، عقلی، روحانی اور مادّی، اور یہ اشیاء دو مقام پر ہیں، آفاق میں اور انفس میں، انفس کا بہترین نمونہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد امامِ عالیمقامؑ ہی کی شخصیت ہے، یعنی آپؑ ہی کا جسمانی وجودِ مبارک وہ عالمِ ذرّ ہے جو ذرّاتی کائنات کی لوحِ محفوظ ہے اور پھر آپؑ کی روحِ علوی ہے، جو روحِ ارواح، روحِ اعظم، نفسِ کلّی اور آفاقی لوحِ محفوظ کا درجہ رکھتی ہے، اور ان دونوں لوحوں کی وحدت وسالمیّت ایسی ہے، جیسے خورشید

اور عکسِ خورشید (جو آئینۂ صاف سے منعکس ہو) بحقیقت ایک ہوتا ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آدمی روحانی ترقی اور بہشت کے بلند ترین درجات کا تصوّر تو رکھتا ہے، لیکن انسانِ کامل جو خدا کی جانب سے نہ صرف اس عروج وارتقاء کا نمونہ ہے بلکہ وسیلۂ ہدایت بھی ہے اس کی عظمت وبزرگی کو نہیں سمجھتا ہے، مثلاً وہ اس حدیث پر ایمان رکھتا ہے کہ: "بندۂ مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرش ہے"۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس حقیقت کی عملی مثال امام ہے، نیز اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ جہاں ایک عام مومن خدا کا عرش بن سکتا ہے تو وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت و نوازش نے پہلے ہی سے امامِ عالیمقام کو لوحِ محفوظ بنا رکھا ہے، مولائے رومی نے اس سلسلے میں کیا خوب کہا ہے:-

عقلِ کُلّ ونفسِ کُلّ مردِ خداست — عرش وکرسی رامدان کزوی جُداست

ترجمہ: مردِ خدا یعنی انسانِ کامل ہی عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ ہے، تُو یہ نہ سمجھنا کہ عرش وکرسی اُس سے الگ کہیں ہیں۔

اُمّ الکتاب کے معنی لوحِ محفوظ کے تو صحیح ہیں، مگر سوال اس کی کیفیت وظرفیّت کے بارے میں ہے، کہ وہ کیسی تختی ہے جو تمام چیزوں کو عقلی، روحانی اور مادّی صورت میں محفوظ کر سکتی ہے؟ کیونکہ کوئی تختی جو عقل وجان کے بغیر ہو، عقول وارواح کو گھیر نہیں سکتی ہے، سوائے کسی عظیم روح کے کہ وہ ایک طرف سے جسمانی چیزوں کو اور دوسری طرف سے عقلی چیزوں کو اپنی ذات سے وابستہ کر لیتی ہے

جس کی مثال نفسِ جزوی سے ملتی ہے کہ اس نے جسم و جان کے لاتعداد ذرات کو اور عقل کی بے شمار باتوں کو اپنی ہستی میں محفوظ کر رکھا ہے۔

جس طرح علم عدد میں "ایک" کے بعد "دو" کا ہونا لازمی امر ہے جو وحدت و کثرت کے درمیان واسطہ اور وسیلہ ہے، اسی طرح اسلام میں خدائے واحد کے اقرار کے بعد دو عظیم ہستیوں کا تصوّر ہے، وہ قلم اور لوح ہیں، اور اس حقیقت کی مثال عالمِ کبیر میں شمس و قمر ہیں، عالمِ صغیر میں عقل و جان ہیں، عرصۂ وجود میں آخرت اور دنیا ہیں اور دَورِ مبین میں ناطقؑ اور اساسؑ ہیں، یہی قلم اور لوح دو عظیم فرشتے یعنی عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ بھی ہیں، اور عرش و کرسی بھی، اور ان دونوں کے مظہر عالمِ جسمانی میں پیغمبرؐ اور امامؑ ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ظاہر میں سورۂ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے، مگر اس مثال میں اُمّ الکتاب اور قرآن کے درمیان جو ظاہری فرق ہے، وہ پوشیدہ نہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص سطحی طور پر دیکھے تو اسے صرف الحمد کی بیرونی صورت نظر آئے گی، اور اس میں مادّی طور پر کامل قرآن کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوگی، لیکن جب کوئی دانشمند اس میں دیدۂ حقیقت بین سے دیکھتا ہے تو اسے اس بات کا یقین آتا ہے کہ بے شک قرآنِ پاک سورۂ فاتحہ کی ہمہ گیر جامعیّت اور وسیع ترین معنوی کیفیت میں سمایا ہوا ہے، یہ اس حقیقت کی ایک روشن اور عمدہ مثال ہے کہ مولا علی صلوٰت اللہ علیہ باطنی اور روحانی اُمّ الکتاب ہے۔

ہر شخص بمثلِ روحانی طور پر اپنے نامۂ اعمال کو جنم دیتا ہے، اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے، اس معنیٰ میں ہر آدمی اپنی ذاتی کتاب (یعنی اعمال نامہ) کی ماں ہے، جیسا کہ قولِ قرآن ہے: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴) اپنا نامۂ اعمال (خود) پڑھ لے، آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔ یہ واقعہ ایسا نہیں کہ صرف جسمانی طور پر مر جانے کے بعد روحانی کتاب یعنی نامۂ اعمال مل جاتا ہو، بلکہ جو شخص جیتے جی نفسانی موت سے مر جائے، اس کو بھی یہ کتاب دی جاتی ہے، یہ مثال اور ثبوت ہے کہ کتابِ ناطق یعنی اساس علیہ السلام بحیثیتِ مجموعی اُمّ الکتاب ہے۔

نصیرؔ الدّین نصیرؔ ہونزائی

۱۴ / مارچ ۱۹۸۴ء

سورۃ بُرُوج کے تاویلی اِسرار

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ۔ بُرجوں والے آسمان کی قسم ① اور اُس دن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے ② اور گواہ کی قسم اور اُس کی قسم جس کی گواہی دی گئی ہے ③ یعنی عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطق اور اساس کی قسم۔

بُرُوج کے معنی ہیں مضبوط قلعے، محلات، نیز بارہ آسمانی بُرج اور برجوں والے آسمان سے عقلِ کُلّ مراد ہے، کیونکہ اسی کے وجودِ جوہری میں عقل و دانش اور علم و حکمت کے مستحکم قلعے، حسین و جمیل محلات اور حدودِ دین کے بارہ بروج موجود ہیں، جیسے مستجیب، چھوٹا ماذون، بڑا ماذون، داعیٔ مکفوف، داعیٔ مطلق، حُجّتِ جزیرہ، حُجّتِ اعظم (حُجّتِ مقرّب) امام، اساس، ناطق، ثانی اور اوّل۔

یومِ موعود (وعدے کا دن) ثانی ہے، یعنی نفسِ کُلّی، اس لئے کہ وقت کا وجود ظاہراً و باطناً اسی سے بنا ہے، اور یہ وہ قیامت ہے جس کی ہستی آسمان و زمین پر محیط ہونے کی وجہ سے بھاری آرہی ہے

(۷/۱۸۷) شاہد (گواہ) ناطقؑ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ اقدس ہے:
اے نبی! ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف اسی کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے (۳۳/۴۵-۴۶) اور مشہود (جس کی گواہی دی گئی ہے) سے اساسؑ مراد ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اور اسی طرح (اے اُمّہ!) ہم نے تم کو عادل اُمّت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسولؐ تم پر گواہ بنیں (۲/۱۴۳).

مذکورۂ بالا قسم کے بعد ارشاد ہے: کہ کفّار ہلاک ہوئے جس طرح خندق والے ہلاک کر دیئے گئے، یعنی ہلاکتِ روحانی سے تباہ ہو گئے ④ کہ آگ بہت ایندھن والی تھی ⑤ جس وقت وہ لوگ اس (آگ) کے آس پاس بیٹھے تھے، یعنی شر انگیزی اور فتنہ پردازی میں مصروف تھے ⑥ اور جو (سلوک) اہلِ ایمان کے ساتھ کرتے تھے، اس کو سامنے سے دیکھ رہے تھے ⑦ اور اُن کافروں نے اِن مومنین میں کوئی عیب نہیں پایا، بجز اس کے کہ یہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو غالب اور سزاوارِ حمد ہے ⑧ وہ (خدا) جس کی سارے آسمان و زمین میں بادشاہت ہے، یعنی اشارہ ہے اس بات کا کہ اہلِ ایمان کو روحانی سلطنت عطا کر دی جائے گی اور خدا ہر چیز پر حاضر ہے، یعنی نورِ خداوندی کی روشنی میں ہر حقیقت کا مشاہدہ ہو جاتا ہے ⑨

بیشک جن لوگوں نے ایماندار مردوں اور عورتوں کو تکلیفیں دیں

پھر توبہ نہ کی ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور جلنے کا عذاب بھی ہے یعنی دنیا میں بحدِ قوّت اور آخرت میں بحدِ فعل آتشِ جہالت میں رہیں گے ⑩ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے، ان کے لئے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، یہی تو بڑی کامیابی ہے، یعنی عقل، روح اور لطیف جسم کی گوناگون نعمتیں میسّر ہوں گی ⑪ بیشک تمہارے پروردگار کی پکڑ بڑی سخت ہے، یعنی انفرادی اور اجتماعی حالت میں خدا کی ظاہری اور باطنی گرفت، کیونکہ اس کی قدرت عقل، روح اور جسم پر محیط ہے ⑫ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ زندہ کرتا ہے، یعنی جس طرح پہلی بار ابداع کیا تھا، اسی طرح دوبارہ ابداع کرے گا ⑬ اور وہی بڑا بخشنے والا محبّت کرنے والا ہے، یعنی اس کی مغفرت کا یہ کمال ہے کہ اس کے نتیجے میں وہ مومنین سے محبّت بھی کرتا ہے ⑭

وہ عرشِ مجید (عالیشان) کا مالک ہے، اس میں مرتبۂ عقل کی تعریف ہے اور اسی کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے ⑮ جو چاہتا ہے کرتا ہے، یعنی اس کا چاہنا بڑا منظم اور صدق و عدل سے بھرپور ہے ⑯ کیا تمہارے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے (یعنی) فرعون و ثمود کی (ضرور پہنچی ہے)، یعنی روحانی طور پر اس کا مظاہرہ ہو چکا ہے ⑰ ⑱ بلکہ یہ کافر جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، یعنی جاہل اور نادان ہیں ⑲ اور خدا ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، یعنی عقل و جان اور

جسم اس کے قبضۂ قدرت میں ہے ⑳ بلکہ وہ تو باکرامت قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، یعنی قرآن جہاں لوحِ محفوظ میں ہے وہاں وہ زندہ اور عقلی معجزات کے ساتھ بڑا معزّز ہے ㉑ ㉒۔

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

امریکا سے دُو سوال

میرے بہت ہی عزیز پیارے نام والے نور دین کو خداوند دونوں جہان کی عزّت عطا فرمائے!

مَیں جان و دل کی حقیقی محبّت سے آپ کو اور دوسرے عزیزوں کو یا علی مدد کہتا ہوں اور بہت سی درویشانہ دعائیں کرتا ہوں، پروردگار قبول فرمائے! آمین!!

آپ عزیزوں نے بہت کم عرصے میں امریکا جیسے مادّی ترقی کے طوفانی ملک میں جو روحانی اور علمی پیشرفت کی ہے، اس کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ ہزار بار قربان ہو جاؤں، میرا غریب دل کہتا ہے کہ امامِ اقدس و اطہر صلوات اللہ آپ سے بہت راضی ہیں، جس کی کئی علامتیں ظاہر ہیں، مثال کے طور پر:-

① آپ کو ایک خصوصی احساس اور شعور ملا ہے کہ علم و عبادت میں زیادہ سے زیادہ کوشاں رہیں، اور عجز و انکساری کے وسیلہ سے کام لے کر اس میں آگے بڑھیں۔

۲ آپ علمی وسائل کی تلاش میں ہر طرح سے کامیاب ہو گئے ہیں، اور اب صرف علمی دولت کا ذخیرہ کر لینا باقی ہے۔

۳ آپ کو سب سے بہترین خدمت کرنے کی توفیق عنایت ہوئی ہے اور آپ اسے انجام دے رہے ہیں، یعنی آپ کرّۂ ارض پر حقیقی علم کی روشنی پھیلانے والوں کے جان نثار دوست اور مددگار بن چکے ہیں، ایسے دوست کہ وہ آپ کو اپنی پیاری روح کی طرح یا اس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔

۴ روز بروز علم و عبادت سے آپ کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے، اور آپ کو ہر وقت اس بات کا انتظار رہتا ہے کہ علم و حکمت کا کوئی تازہ پھل یا پھول کب ملے گا، کوئی ایسا خط یا مقالہ یا کتاب کب دستیاب ہوگی، جس میں امامِ عالی مقامؑ کے بھیدوں کی باتیں ہوں۔

۵ آپ کو ایک مذہبی محبّت اور تڑپ کی صورت میں یہ توفیق بھی عنایت ہوئی ہے کہ مولا پاک کے گھر جایا کریں اور جماعتی روح کی عظیم حکمتوں سے فائدہ اٹھائیں، نیز یہ کہ خصوصی علم کے ذرائع سے منسلک رہیں، الحمد للہ یہ ساری علامتیں آپ میں پائی جاتی ہیں۔

میرے پیارے نورِ دین! آپ نے اپنے جس خواب کا ذکر میرے بہت ہی عزیز محمد صدرِ عارف سے کیا ہے، وہ ایک نورانی خواب ہے، جس میں روحانی ترقی کے آغاز ہونے کا اشارہ ہے، کیونکہ روحانی عروج کے زینے چار ارواح پر مبنی ہیں، وہ روحِ نباتی،

روحِ حیوانی، روحِ انسانی، اور روحِ قدسی ہیں، ہاں روحانی ترقّی کا مشاہدہ روحِ نباتی سے شروع ہو جاتا ہے، قرآنِ حکیم بی بی مریم علیہا السّلام کی اسی منزل سے متعلق فرماتا ہے:-

وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (۳۷/۳) اور اُگایا اس کو اُگانا اچھا۔

اس کی تاویل یہ ہے کہ حضرت مریمؑ بیت الخیال کی ابتدائی ترقی کے وقت خواب و خیال میں باغ و گلشن جیسی اُگنے والی خوبصورت چیزیں دیکھتی تھیں، یہ روحِ نباتی کے مراحل کو طے کرنے کی علامت ہے، مگر یہاں ایک بات یاد رہے کہ آگے چل کر بھی ایسے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں، کیونکہ چیزیں پہلے ترتیب سے سامنے آتی ہیں، اور پھر حسبِ منشا ہر چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے، جیسے بہشت کا اصول ہے (۳۵/۵۰)

اس سلسلے میں آپ سب عزیزوں کو ایک اور مضمون "لنڈن سے پانچ سوال" کی کاپی بھیج رہا ہوں، شاید پہلے نہ بھیجا ہو، تاکہ آپ اس میں سے بھی علمی فائدہ اٹھائیں، اس میں دوسرے سوالوں کے علاوہ میرے عزیز عبدالرحمٰن نے ایک نورانی خواب کے بارے میں پوچھا ہے جو آپ کے خواب کی طرح ہے، امید ہے کہ آپ عزیزان خداوند کی رحمت سے خوش ہوں گے۔

آپ کا ایک اور سوال میرے پاس آیا ہے، وہ یہ آیۂ مقدّسہ ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲/۲۸) کیونکر اللہ کے ساتھ

کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے پس تم کو جِلایا، پھر تم کو مردہ کرے گا پھر تم کو جِلا دے گا پھر اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے۔

یہ سوال بنا بنایا نہیں تھا، اس لئے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس میں بنیادی سوال البتہ "کُنتُمْ اَمْوَاتًا" میں پوشیدہ ہے، یعنی "تم مردہ تھے" فرمانے میں کیا حکمت ہے؟ حالانکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان موجودہ زندگی سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا، اور اگر یہی تصوّر درست ہوتا تو قرآنِ حکیم فرماتا کہ تم کچھ بھی نہ تھے، لیکن جب قرآن جیسی حکیمانہ کتاب میں "کُنتُمْ" کا لفظ آیا تو ہوش مند پر واجب ہوا کہ وہ اس میں غور کریں اور پوچھے، کیونکہ عربی اور پھر قرآنِ حکیم کی زبان ایسی نہیں کہ اس میں ادائے مطلب کے لئے کسی طرح کی مجبوری ہو، اس سوال کو ہم اس طرح بھی اُجاگر کر سکتے ہیں کہ جب کوئی آدمی جسمانی طور پر مر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ فلان شخص مر گیا ہے یا کہتے ہیں کہ مر گیا تھا، یہ بالکل "کُنتُمْ اَمْوَاتًا" کی طرح ہے یعنی تم مردہ تھے، اس لئے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو وہ اصل وجود کے اعتبار سے "مُردہ" اور "تھا" کے دونوں معنی رکھتا ہے، کیونکہ مر جانے کا ثبوت جسم ہے جو آگے چل کر مٹ جائے گا، اور "ہے" "یا تھا" کی دلیل روح ہے جو موجود ہے مگر اُس جسم سے جُدا ہو چکی ہے۔

بہرکیف اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان کسی ابتداء و انتہا کے بغیر ہمیشہ ہمیشہ فنا و بقا کے درمیان اس طرح سفر کر رہا ہے کہ کبھی

مُردہ کہلاتا ہے اور کبھی زندہ، اور یہ دونوں باتیں کئی معنوں میں درست ہیں، مگر اس میں جو موت یا فنا ہے، وہ عدمِ محض یعنی قطعی NOTHINGNESS نہیں، بلکہ ہر زندہ مخلوق کی زندگی کا ایک معیار مقرّر ہے، اسی طرح انسانی حیات و بقا کے لئے بھی احساس وشعور کی ایک حدّ ہے، پس اگر کوئی شخص اس حدّ سے پیچھے ہے تو حیوان ہونے کے معنی میں مُردہ ہے، اور آگے گزر چکا ہے تو فرشتہ بن جانے کے معنی میں مر چکا ہے، جیسے فرمایا گیا ہے کہ "مرجانے سے قبل مرجاؤ" ($\frac{۵۵}{۲۸-۲۶}$) جیسے سورۂ رحمان ($\frac{۵۵}{۲۸-۲۶}$) میں فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا ذکر ہے، پس "کُنتُمْ اَمْوَاتاً" میں ایسی موت کا ذکر ہے، کہ وہ قطعی موت نہ تھی، بلکہ وہ عالمِ امر کی ایک ایسی زندگی تھی جس میں روح ہوتی ہے مگر علم نہیں ہوتا۔

اس آیۂ کریمہ کا ایک اور تاویلی پہلو ہے، وہ یہ کہ "اے مومنین تم کیوں کر ناسپاسی کرتے ہو اللہ کے ساتھ، حالانکہ تم میں ذکر و عبادت اور علمِ دینِ حق کی روح نہیں تھی، پس اُس نے تم کو یہ روح دے کر زندہ کیا، پھر تم پر سلسلۂ روحانیت میں مرحلۂ عزرائیلؑ آئے گا، جس میں نفسانی موت ہے، پھر تم کو نورِ علم و حکمت سے زندہ کرے گا اور پھر نتیجے کے طور پر تم خدا تک پہنچ جاؤ گے۔"

نور دین! آپ اپنے عزیز ساتھیوں کو میری طرف سے یا علی مدد کہہ دیں، امید ہے کہ یہ علمی خط حلقۂ احباب میں پڑھا جائے گا،

نیز اس کی کاپیاں خانۂ حکمت اور عارف کے ہیڈ کوارٹرز اور تمام شاخوں میں بھیجی جائیں گی اور یہی ہمارا اصول ہے کہ ہمارا خط علمی مقالے کی صورت میں ہوتا ہے، اور اس میں کچھ وقت لگا کر بڑی ذمہ داری سے لکھا جاتا ہے اور آگے چل کر یہی خطوط مستقل کتاب کا حصہ بن جاتے ہیں، پس یہ خط علمی بھی ہے اور تاریخی بھی۔

فقط آپ کا دعاگو
نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی

ISW
Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سورۂ قیامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ مَیں روزِ قیامت (یعنی روحانیت) کی قسم کھاتا ہوں ① اور (بُرائی سے) اپنے اوپر ملامت کرنے والے جی کی قسم کھاتا ہوں (کہ انبعاث برحق ہے) ② کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو (بوسیدہ ہونے کے بعد) جمع نہ کریں گے۔ ہڈیوں سے ذرّاتِ لطیف مراد ہیں، جن کی یکجائی سے جسمِ مثالی بن جاتا ہے ③ ہاں ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی پُور پُور درست کریں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں اٹھائیس ۲۸ پُور ہیں، جو ۲۸ حُجتّوں کو ظاہر کرتی ہیں، جن میں سے دونوں انگوٹھوں کی چار پُور چار مقرّب حجتّوں کی مثال ہیں، اور باقی انگلیوں کی ۲۴ پُوریں دن اور رات کے باقی چوبیس حُجتّوں کی دلیل ہیں، جن کا تعلق بارہ جزائر سے ہے، کیونکہ انسان کی روحانی حیات و بقا اور انفرادی قیامت کا لگاؤ ذرّاتِ لطیف، حُجتّانِ روز و شب اور امامِ عالیمقامؑ سے ہے ④

بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے بھی (ہمیشہ) بُرائی کرتا چلا جائے گا ⑤ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہو گا ⑥ تو جب آنکھیں چکا چُوند میں آ جائیں گی ۔ یعنی جب روحانیت کی تیز روشنی سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی ⑦ اور چاند میں گرہن لگ جائے گا۔ یعنی روحانی مسافر کی حیثیت جو ماہِ کامل کی طرح چمکنے لگی تھی، وہ ایک بار مدّھم ہو جائے گی، جس طرح یہ ذکر ہو چکا ہے کہ پہلے روحانی پیدائش ہے، پھر نفسانی موت آتی ہے، اور آخر میں انبعاث ہے ⑧ اور سورج اور چاند اکٹھا کر دیئے جائیں گے۔ یعنی اُس وقت روحانی مسافر (سالک) کی "انا" حدودِ دین کی سیڑھی پر جو حُجّتِ اعظم تک پہنچ گئی تھی، وہ امامِ اقدس واطہرؑ سے واصل ہو جائے گی، اور یہی اس کا انبعاث ہے ⑨ انسان کہے گا آج کہاں بھاگ کر جاؤں۔ یعنی انبعاث کا تعلق روح اور انا سے ہے، مگر جسم جب تک زندہ ہے، اُس پر شدید قسم کی تکالیف کا آنا لازمی ہے، جس کی مثال انبیاء علیہم السّلام کی حیاتِ طیبّہ سے مل سکتی ہے ⑩ یقین جانو کہیں پناہ نہیں ⑪ اُس روز تمہارے پروردگار ہی کے پاس ٹھکانہ ہے۔ یعنی جسمانی مصائب وآلام سے زندگی میں ہنگامی نجات اور مرنے کے بعد دائمی نجات خدا تعالیٰ ہی کے حضور میں ملتی ہے ⑫

اُس دن آدمی کو جو کچھ اُس نے آگے بھیجے کیا ہے بتا دیا جائے گا ⑬ بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہو گا۔ یعنی شعوری قیامت

میں نامۂ اعمال جو بولتی کتاب ہے اُس سے سب کچھ ظاہر ہوگا، اس معنیٰ میں انسان چشمِ باطن سے اپنے جملہ احوال کو دیکھ سکتا ہے (۱۴) اگرچہ وہ عذر معذرت کرتا رہے (۱۵)

(اے رسولؐ) وحی کے جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس میں حضورِ اکرمؐ کے اسمِ اعظم اور ذکرِ قلبی سے متعلق ہدایت بھی ہے (۱۶) تحقیق اس کا (تمہارے قلب میں) جمع کر دینا اور پڑھنا ہمارے ذمّہ ہے۔ یعنی سَر کی زبان سے نہیں بلکہ سِرّ کی زبان سے پیغمبرِ خداؐ نے اسمِ اعظم کا ذکر کیا، اور یہ دراصل فرشتے کی زبان ہے، جس میں آنحضرتؐ پر قرآن نازل ہوا (۱۷) تو جب ہم اس کو (جبرائیل کی زبانی) پڑھیں تو تم بھی اسی طرح پڑھا کرو (۱۸) پھر اس (کی تاویل) کا سمجھا دینا بھی ہمارے ذمّہ ہے۔ یعنی ہر زمانے میں معلمِ قرآن ہوا کرے گا، جو خدا اور رسولؐ کی جانب سے مُؤَوِّل (مُؤَوِّل = تاویل کرنے والا) ہوگا (۱۹)

(لوگو! جیسا تم سمجھتے ہو) ایسا نہیں بلکہ تم دنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو۔ یعنی اصولِ روحانیت کو نظر انداز کر رہے ہو (۲۰) (۲۱) اُس روز بہت سے چہرے تو تروتازہ بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔ یعنی اُن لوگوں کی سب سے بڑی خوشی اس بات سے ہوگی کہ وہ اپنے ربّ العزّت کو ایک طرح سے دیکھ سکیں گے، اور پہچان لیں گے

(۲۲) (۲۳) اور بہتیرے منہ اُس دن اداس ہوں گے (۲۴) سمجھ رہے ہیں کہ ان پر وہ مصیبت پڑنے والی ہے کہ کمر توڑ دے گی۔ اس میں علمی و عرفانی مفلسی کی طرف اشارہ ہے (۲۵)

(لوگو! جیسا تم سمجھتے ہو) ایسا نہیں جب جان (بدن سے کھچ کے) ہنسلی تک آپہنچے گی اور کہا جائے گا کہ (اس وقت) کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے (۲۶) (۲۷) اور مرنے والے نے گمان کیا کہ اب (سب سے) جُدائی ہے۔ اس میں نفسانی اور جسمانی دونوں قسم کی موت کا ذکر ہے (۲۸) اور (شدّتِ سکراتِ موت سے) ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے اُس دن تجھ کو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں چلنا ہے (۲۹) (۳۰)

تو اُس نے نہ (کلامِ خدا کی) تصدیق کی نہ نماز پڑھی۔ تصدیق صدّیقِ اکبر (اساس یہ علیؑ) کے وسیلے سے ہوتی ہے، یعنی اساس کی تاویل کی پیروی کرنا تصدیق ہے اور نماز کی تاویل آئمۂ طاہرین سے وابستگی ہے (۳۱) مگر جھٹلایا اور (ایمان سے منہ موڑا) پھر اپنے گھر کی طرف اِتراتا ہوا چلا (۳۲) (۳۳) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے پھر (مکرّر سن لے کہ) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے (۳۴) (۳۵) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ یعنی اگر کوئی شخص آتشِ جہالت میں ہلاک ہو جائے تو پھر بھی اسے قانونِ رحمت زندہ کر دے گا (۳۶) کیا وہ (ابتداءً) منی کا قطرہ نہ تھا جو رحم میں ڈالی

جاتی ہے پھر لوتھڑا ہوا پھر خدا نے اسے بنایا پھر اسے درست کیا۔ اس میں نہ صرف جسمانی تخلیق کا ذکر فرمایا گیا ہے، بلکہ روحانی تکمیل کا بھی تذکرہ ہے ۳۷ ۳۸ پھر اس میں سے دو جوڑے بنائے (یعنی ایک) مرد اور (ایک) عورت۔ یعنی ایک ہی نور سے عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ کا وجود بنایا، نیز ایک ہی نور سے ناطقؑ اور اساسؑ موجود ہوئے ۳۹ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ (روحانیت اور قیامت میں) ہر قسم کے مُردوں کو زندہ کرے۔ یعنی یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عقلی، روحانی اور جسمانی مُردوں کو زندہ کرے گا، کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے ۴۰

توضیح : قرآنِ حکیم میں اکثر و بیشتر ایک ایسی قیامت کا ذکر ملتا ہے، جو ایک طرف سے انفرادی ہے اور دوسری طرف سے اجتماعی۔ کیونکہ وہ شعوری طور پر صرف ایک ہی فرد کی قیامت ہوا کرتی ہے، مگر غیر شعوری طور پر سب کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا وقوع عالمِ ذرّ میں ہوتا ہے، جہاں تمام مُردوں اور زندوں کا بصورتِ ذرّات انتہائی عظیم اجتماع ہوتا ہے لیکن لوگ اس سے بے خبر رہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:۔

اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے جس طرح ہم نے اوّل بار تم کو پیدا کیا تھا (۶/۹۴) اِس آیۂ حکمت آگین میں اجتماعی قیامت کے پہلو کو چھوڑ کر انفرادی قیامت کا ذکر کیا گیا ہے، اور ثبوت پیش کیا

گیا ہے کہ جس طرح لوگ دُنیا میں فرداً فرداً آتے ہیں، اسی طرح یہ یکے بعد دیگرے درجۂ کمال پر خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں، جس کی ایک روشن مثال حضراتِ انبیاء و اُئمہ علیہم السّلام کے مختلف زمانوں میں فرداً فرداً اور الگ الگ آنے جانے سے ظاہر ہے۔ والسّلام۔

نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائیؔ

۵؍ اپریل ۱۹۸۴ء

تجلّیات و ظہورات

عزیزانِ خانۂ حکمت کراچی کی پیاری خدمت میں
خداوندِ قدوس شرق و غرب کے تمام عزیزوں کو دونوں جہان
کی سلامتی عطا فرمائے، آمین!

اِس وقت بندۂ مسکین یہ خط اپنے قریہ حیدرآباد (ہونزہ) سے تحریر کر رہا ہے، کل بعد دعائے خفتن خانۂ حکمت کی ایک اہم میٹنگ ہوئی تھی، جو بارہ بجے تک جاری رہی، جس میں زیادہ سے زیادہ وقت مجھے دیا گیا، مجھے یہاں کے عزیزوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، کیوں نہ ہو میرے عزیزان سب کے سب مولائے پاک کے باغِ روحانیت کے زندہ پھول ہیں، ایسے اعلیٰ اور پسندیدہ پھول، جو عقل و دانش اور علم و حکمت کی رنگینیوں اور خوشبوؤں سے بھرپور ہیں، جن کی ہمنشینی آنکھوں کو منوّر اور دماغ کو معطّر کر دیتی ہے اور اسی طرح نور و سرور اور جلوۂ طور کا قصہ چھڑ جاتا ہے۔

میرے انتہائی عزیز دوستو! امامِ عالی مرتبت صلوات اللہ علیہ

ISW Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science Knowledge for a united humanity

کی مقدّس محبّت اور پھر معرفت میں جو بے پایان خزانے پوشیدہ ہیں اور جیسی لازوال دولت پنہان ہے، اس کا بار بار تذکرہ بار بار موسمِ بہار کی آمد کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نور کے گوناگون جلوؤں کی طرح نشاط آور ہے۔

ہمیں نورِ حقیقت کی روشنی میں خوب سوچنا چاہیئے کہ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (۵۵/۲۹) کا کیا مطلب ہے؟ ہر روز وہ ایک شان میں ہوتا ہے، جس طرح کبھی ایّام ختم نہیں ہوتے، اسی طرح اس کی شئون (شانیں) لاانتہا ہیں، اس کے معنی تجلّیات وظہورات ہیں اور وہ تین قسموں میں ہیں: عقلی یا علمی، روحانی اور صوری، ہمیں آپس میں اس پر بھی مذاکرہ کرنا چاہیئے کہ عقلی، روحانی اور صوری تجلّیات میں کیا فرق ہے؟

اہلِ دانش کے نزدیک خداشناسی (معرفت) ایک مسلّمہ حقیقت ہے، جو تجلّیات سے وابستہ ہے، اور یہ نوع بنوع تجلّیات اور ظہورات اسمائے صفات سے متعلق ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہر صفت کے تین پہلو ہیں یا تین مظہر ہیں یا ۳ گانہ جلوہ گاہ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ایک نام "النّور" ہے، جس کا ظہور تین درجوں میں ہوا کرتا ہے، وہ تین درجات عالمِ عقل، عالمِ روحانیت اور عالمِ انسانیت ہیں، ہر درجہ میں کئی ذیلی درجات ہُوا کرتے ہیں، اور بحیثیتِ مجموعی اعلیٰ درجات آسمان اور ادنیٰ درجات زمین کہلاتے ہیں۔

خدا کا ایک اسمِ صفت "ربّ" ہے، یعنی پروردگار، جو انسانیت کی عقلی، روحانی اور اخلاقی پرورش کرتا ہے، جس کا تفصیلی مُشاہدہ بموجبِ قانونِ معرفت ضروری ہے، کیونکہ سالک، عاشق اور عارف کے لئے مشاہدۂ تجلیات و ظہورات ازبس ضروری ہے، اور قرآنِ مقدّس کی جملہ ہدایات کی غرض و غایت مشاہدۂ اسماء ہے، جس کی ابتداء خدا کے ایک ایسے اسم سے ہوتی ہے جو اہلِ سعادت کے لئے نزدیک اور آسان ہے، کیونکہ اللہ پاک اپنے بندوں کے لئے ہر طرح کی آسانی چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا، پروردگارِ عالم کا وہ اسم امامِ زمانؑ ہیں، جو قرآنِ حکیم کی زبان میں "الظّاہر" ہے، یہی اسم جو ظاہر ہے وہ زندہ یعنی حَیّ بھی ہے اور قیّوم بھی، جیسے یہ ظاہر ہے، ایسے یہ مُظہِر بھی ہے اور مُظہَر بھی، مُظہِر اور مَظہر کے معنی میں یہ آئینۂ صفات و تجلّیات بھی ہے اور ان معنوں میں نورِ خدا بھی ہے۔

جب خدا ایک ہے تو اس کا اسمِ اعظم بھی ایک ہی ہے، مگر اس کے ظہورات کثیر ہیں، یعنی خدا کے بہت سے نام اسمِ بزرگ کے مختلف جلوے یا تجلّیات ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ خدا کا بزرگ اور زندہ نام امامِ زمانؑ ہیں۔

امامِ زمانؑ کے غلاموں کا غلام
نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی

۱۵ر اپریل ۱۹۸۴ء

کتابِ مکنُون

میرے بہت ہی عزیز صدرِ خانۂ حکمت فتح علی حبیب اور ہماری آسمانی بیٹی گلشکر سلامت رہیں!

میں ہزار گونہ خیر خواہی اور انتہائی خلوص کے ساتھ آپ کو اور جملہ عزیزانِ شرق و غرب کو یا علی مدد کہتا ہوں، اور بہر عاجزانہ دعا میں یاد کرتا ہوں، خداوندِ قدوس اسے قبول فرمائے! آمین!!

یہ بات بڑی مسرّت بخش اور صداقت سے بھرپور ہے، اِس لئے اس کو دہرانا چاہیئے کہ آپ دونوں میرے لختِ جگر ہیں، میرے قابلِ فخر شاگرد اور علمی فرزند، میرے سینئر عملدار اور بہت ہی عزیز بچے، میرے بہت سے علمی بھیدوں کے جاننے والے، میری پشت پناہی کرنے والے، میرے خانۂ حکمت کا درختِ پُرثمر، جس کی پیاری پیاری شاخیں افراد بھی ہیں، ادارے بھی، جن کے پھول اور پھل، رنگ و بو اور لذّت و حلاوت سے بھرے ہوتے ہیں۔

خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف سے وابستہ افراد کی کتنی بڑی سعادت ہے کہ وہ قرآن اور روحانیت کے بلند ترین خزانوں سے علم و حکمت کے گرانقدر جواہر کا ذخیرہ کر لیتے ہیں، تاکہ پیاری جماعت

کی بہترین علمی خدمت کر سکیں، یقیناً امامِ اقدس واطہر صلوات اللہ علیہ کے عرفانی اسرار (بھید) بڑے حیرت انگیز ہیں، جن کو صرف اہلِ سعادت ہی جانتے ہیں، یہ بھید اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات ہیں، جن میں مومنین کی عزت و برتری پوشیدہ ہے۔

اس سلسلے کی ایک مثال یہ ہے کہ امامِ عالیمقام علیہ السّلام کتابِ مکنون ہے جس میں قرآنِ حکیم کی حکمت پوشیدہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ امام کا علمی مرتبہ لوگوں سے پنہاں ہے، نیز امام کا نور مومنین کی روحانیت میں کام کرتا ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ کتابِ مکنون کتابِ عقل ہے، یعنی نورِ عقل، جو روحانیّت کا آخری مرتبہ ہے، اور ان تمام معنوں میں امامِ زمان کی تعریف ہے۔

کتابِ مکنون جس میں قرآن ہے، اس کو کوئی چھو نہیں سکتا، مگر وہ لوگ جو پاک کئے گئے ہیں، (۵۶/۸۰) یعنی امامِ اقدس واطہرؑ کے اس مرتبۂ اعلیٰ سے علم و معرفت حاصل کرنے کے لئے ازبس پاکیزگی چاہیئے، یعنی ہر قسم کی پاکیزگی، مگر یہ پاکیزگی جیسا کہ قرآن میں ذکر ہے بحکمِ خدا پیغمبرِ اکرمؐ اور امامِ زمانؑ کے وسیلے سے ہو سکتی ہے۔

اگرچہ ظاہراً قرآن سامنے ہے، لیکن اس کے عظیم اسرار (بھید) کتابِ مکنون میں پوشیدہ ہیں، اگر آپ بدرجۂ علم الیقین قرآنی اسرار میں سے جانتے ہیں، تو یہ آپ کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے، اور آپ کی "انا" پاک ہے، ورنہ یہ فضیلت حاصل نہ ہوتی۔

بے شک کتابِ مکنون امامِ عالیمقام ہے اور اُس کی پاک ہستی تک رسائی، قرآن کی زبان میں (مَسّ $\frac{56}{79}$) چھونا تین درجوں پر مکمل ہو جاتا ہے، پہلا ظاہر میں، دوسرا روحانیت میں اور تیسرا مقامِ عقل پر، جس طرح کسی خاموش کتاب کو چھونے کا مقصد پڑھنا ہے، اسی طرح بولنے والی کتاب کو چھونے کے معنی ہیں، رسائی اور انتہائی قربت و نزدیکی، تاکہ وہ خود اپنی علمی اور عرفانی ہستی کو پڑھ پڑھ کر آپ کو سُنائے اور سکھائے۔

مومنین اور مومنات کو قیامت یعنی روحانیت میں کتابِ مکنون (نورِ امامت) سے انتہائی رسائی ہو جاتی ہے اور یہ کتاب ان کے آگے اور داہنی طرف چلتی رہتی ہے ($\frac{57}{12}$) اور اسی عمل میں تمام حکمتیں جمع ہو جاتی ہیں۔

قرآنی الفاظ اور جملوں کے آپس میں معنوی اِرتباط و رشتہ ہوا کرتا ہے، لہٰذا کتابِ مکنون اور لُولُوئے مکنون کا ایک ہی ممثول ہے اسی طرح لُؤلُؤ کی مناسبت کنز (گنج) سے ہے، کنز کا تعلق مِفتاح یا مِقلد (جمع مقالید) سے ہے، جو فتح سے متعلق ہے، اور اسی طرح معنویتِ مشترکہ کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

خاکپائے مومنان
نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی۔ از ہونزہ

۱۹ را پریل ۱۹۸۴ء

انفرادی روح اور جماعتی روح

میرے بہت ہی عزیز بچے صدر محمد عبدالعزیز اور عزیزہ بیٹی یاسمین کو خداوندِ مہربان دونوں جہان کی سلامتی عنایت فرمائے!

خلوص، روحانی محبت اور صداقت سے بھرپور یا علی مدد قبول ہو! ایسی قلبی دعاؤں کے ساتھ تمام عزیزوں کو بھی یاد کرتا ہوں، اور یہ یاد شکرگزاری کا باعث بنتی ہے، الحمد للہ علیٰ احسانہ۔

آپ عزیزوں کی گرانقدر خدمات اور بے مثال قربانیاں جو حقیقی علم کو ہمیشہ محفوظ رکھنے اور پھیلانے کے لئے پیش کرتے ہیں، وہ سدا بہار باغ و گلشن کی طرح مسرّت انگیز اور روح افزا ہیں، آپ مقصدِ علم کے لئے جان نثار اور شمعِ معرفت کے پروانہ ہیں، آپ ہمیں بہت ہی عزیز ہیں، اس لئے کہ آپ میری روح کے اجزا ہیں، ہم انفرادی ارواح میں الگ الگ ہیں مگر اجتماعی روح میں ایک ہیں، الحمد للہ۔

ایک شخص کی روح انفرادی روح کہلاتی ہے، جماعت کی روح اجتماعی روح ہوتی ہے، ہر وہ مومن جماعتی روح میں زندہ ہو سکتا

ہے، جو خلوصِ نیّت سے جماعت کی مفید خدمات انجام دیتا ہو، خدمت جس قدر زیادہ اور دُور رس ہو، روح اس قدر وسیع ہو جاتی ہے۔

آپ میں سے ہر ایک میں ایک ہی روح ہے، مگر اس کے ذرّات اتنے ہیں، جتنے کہ دنیا بھر کے لوگ، بلکہ اُن سے بھی زیادہ، یہ قانونِ روح اس لئے ایسا ہے، تاکہ ہر وہ شخص جو جماعت کی خدمت کرتا ہو جماعتی روح میں زندہ ہو جائے، وہ اِس طرح کہ اس کی روح کے ذرّات کا ایک گروپ جماعت کی نمائندگی کرتا ہے، یعنی ایک ذرّہ ایک فرد کو ظاہر کرتا ہے یا فرد ذرّہ میں زندہ ہو کر بولنے لگتا ہے اسی طرح آپ کی ذات میں پوری جماعت کی روح سما جاتی ہے۔

جس طرح یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز اور ہر شخص کی ایک رُوح ہوا کرتی ہے، اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ قوم اور جماعت کی بھی قومی اور جماعتی روح ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ ابراھیمَ کانَ اُمَّۃً قَانِتاً لِّلّٰہِ حنیفاً ط وَلم یَكُ من المشرکین (۱۶/۱۲۰) بیشک ابراہیمؑ خدا کی ایک فرمانبردار اُمّت تھے جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اِس آیۂ کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مراتب میں سے اُس مرتبے کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں آپؑ پوری اُمّت کی پاکیزہ روح بن چکے تھے یعنی آپ کی روح کے ذرّات میں اُمّت کے تمام افراد زندہ ہو گئے

تھے، اسی طرح آپ کی ہستی میں اُمّت کی روح پوشیدہ تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح انفرادی اور جماعتی روح ہے اسی طرح اُمّتی روح بھی ہے جس کا ذکر ہوا، اور کائناتی روح بھی ہے جس کو نفسِ واحدہ کہا جاتا ہے، جس کا ذکر قرآن و حدیث دونوں میں موجود ہے (۳۱/۲۸) حدیثِ شریف یہ ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ وَالأَنبِيَاءُ كَنَفْسٍ وَّاحِدَة = مومنین بھائی ہیں اور انبیاء ایک جان (یعنی کائناتی روح) کی طرح ہیں۔ اس ارشاد کا کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر ناطق اور اس کا اساس اپنے مومنین کے روحانی پدر و مادر ہیں اور بمرتبۂ نفسِ کُلّی نہ صرف دونوں بلکہ جملہ ناطقان و اساسان ایک ہیں، اور ہر اُمّت کے مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں یہاں یہ ارشاد ہے کہ مومنین اپنے روحانی والدین کے نقشِ قدم پر چل کر آخر کار نفسِ واحدہ میں زندہ ہو جائیں گے، کیونکہ نفسِ واحدہ کا تعلق کسی ایک فرد سے نہیں بلکہ آگے چل کر فرداً فرداً سب اس میں سما جانے والے ہیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:۔

ما خلقکم ولا بعثکم الّا کنفسٍ واحدہ ۳۱/۲۸ تمہارا (روحانی) جنم اور انبعاث ایک جان کی طرح ہے، یعنی جب تم میں سے کوئی روحانی طور پر پیدا کیا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ میں ذرّاتِ روح کے توسّط سے تمام لوگوں کے پیدا کئے جانے کی نمائندگی کرتا ہے اور جب اس کا انبعاث ہو جاتا ہے تو اس میں بھی سب کی نمائندگی ہو

جاتی ہے، اِس معنیٰ میں سب کی روحانی پیدائش اور انبعاث ایک جان کی طرح ہے، اور یہی واقعہ زمانہائے دراز میں ہر روح پر گزرتا ہے۔

فقط عزیزوں کا علمی خادم
نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی
۲۲ اپریل ۱۹۸۴ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

علمی اور رُوحانی رِشتہ

میرے بہت ہی عزیز نصر اللہ نائب صدرِ خانۂ حکمت اور عزیز بیٹی امینہ کو خداوند دونوں جہان کی کامیابی اور سرفرازی عنایت کرے!

میں ایسے قلب کی گہرائی سے یا علی مدد کہتا ہوں، جس نے نورِ اسلام کے بے شمار عجائب و غرائب اور لاتعداد علمی معجزات دیکھے ہیں، آپ دونوں عزیزان میرے خداداد (GODGIVEN) بچے ہیں، آدمی کا ایک بچہ وہ ہوتا ہے جو ماں باپ کی ہزاروں مشقتوں کے بعد بڑی مشکل سے دین و دنیا کا مفید کام کرنے لگتا ہے، دوسرا فرزند وہ ہوتا ہے جو پروردگارِ عالم تے اپنی رحمتِ بے نہایت سے عنایت کر دیا ہو، ایسا بچہ گویا آسمان سے کسی مشقت کے بغیر ملتا ہے، یہ تصور میرے نزدیک ایک ٹھوس حقیقت ہے، کیونکہ میں نہ صرف رشتۂ ارواح کا قائل ہوں، بلکہ ان کی وحدت کو بھی بہت ہی قریب سے دیکھ رہا ہوں۔

دنیا کے ہر ہنر اور ہر پیشہ میں استاد اور شاگرد باپ بیٹے کی طرح ہوا کرتے ہیں، کیونکہ ہنرمندی کی روح جو شاگرد میں پیدا ہو جاتی ہے، وہ استاد سے آتی ہے اور خاص کر علم کی روح ایک زندہ حقیقت ہے، لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ معلّم اور متعلّم باپ بیٹے کی طرح ایک دوسرے کو عزیز ہوا کرتے ہیں، اور یہ رشتہ بڑا پیارا ہوتا ہے جو اٹوٹ ہے۔

امام برحق صلوات اللہ علیہ کے ساتھ ہم سب کا جو روحانی رشتہ ہے وہ سب سے اعلیٰ اور بے مثال ہے، اس کے مقابلے میں کوئی رشتہ ٹھہر نہیں سکتا، تاہم ابتدا میں ذیلی چیزیں سامنے آتی ہیں، اور اس میں خدائی مصلحت و حکمت ہے۔

نورِ امامت کے ساتھ ہم مریدوں کے جو جو رشتے ہیں وہ سب آج ظاہر نہیں، مگر بعض ظاہر ہیں، ان تمام میں سے ایک خاص رشتہ یہ ہے کہ امامؑ ہمارا نور اور روح ہیں (۵۷/۱۲ ، ۸۵/۱۷) امامِ عالی صفات صلوات اللہ علیہ مومنین کا اپنا نور اس معنیٰ میں ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نُورُهُمْ (یعنی مومنین کا نور) یہ رشتہ عام نہیں بلکہ خاص ہے جس کو سمجھنے کے لئے متعلقہ آیۂ کریمہ میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور امام علیہ السّلام ہماری اپنی روح اس لئے ہیں کہ یہی مذکورۂ بالا نور روح ہے، جس کے ساتھ ہمارے رشتے کا ذکر ہوا، نیز اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ جس طرح جماد کی روح نبات ہے

اس لئے اسے نباتات میں منتقل ہو جانا چاہیئے، نبات کی بڑی روح حیوان ہے، لہٰذا اسے حیوانات میں فنا ہو جانا ضروری ہے، حیوان کی بڑی روح انسان ہے، اس لئے اسے یہاں آنے کی خاطر قربان ہو جانا لازمی ہے اور انسان کی روحِ اعظم انسانِ کامل ہے، جس میں منتقل ہو جانے کے واسطے دو چیزوں کی ضرورت ہے، اور وہ حقیقی علم اور نیک عمل ہیں۔

قرآن کی حکمتی زبان اور روحانیت کے علمِ مخفی کے مطابق امام مومن کا قلب (دل) ہیں، اور قلب سے روح اور انائے عُلوی مراد ہے، اس کلیدی تصوّر کی بدولت قرآن و حدیث کے بہت سے اسرار منکشف ہو سکتے ہیں، جو مومنین کے لئے خاص ہیں۔

"وہ اپنی روح کے عاشق تھے" یہ ایک مبارک فرمان کے پُر حکمت الفاظ ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ امام مومنین کی سب سے بڑی روح ہے، اس معنیٰ میں بزرگانِ دین کا امام سے عشق دراصل اپنے آپ سے عشق تھا، جیسے پیر ناصر خسروؒ نے فرمایا:

پس و پیش و نہان و آشکار اوست شناسائے خود و پروردگار اوست

ترجمہ: آخر، اوّل، باطن اور ظاہر وہ (انسانی حقیقت) ہے۔ اپنے آپ کا عارف اور معروف[۱] (یعنی ربّ) وہ ہے۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۲۴، اپریل ۱۹۸۴ء

[۱]: عارف اور معروف = پہچاننے والا اور پہچانا ہُوا۔

عالمِ خواب کی حکمتیں

خواب ایک باطنی عالم ہے جو دنیائے ظاہر سے مختلف اور عجائب و غرائب سے بھرپور ہے، کیوں نہ ہو جبکہ ایک طرف سے عالمِ خیال اُس سے متّصل ہے اور دوسری جانب سے جہانِ روح ملا ہُوا ہے یا بطریقِ اختصار یوں کہا جائے کہ کامل انسانوں میں خیال، خواب اور روحانیت کے واقعات و مشاہدات یکسان اور ایک ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک عام آدمی کا خیال اور خواب راہِ روحانیت کا سفر ہے، جسکی منزلِ مقصود روحانیت اور آخرت ہے۔

خدا کے دوستوں (اولیاء) کا خواب روحانیت و نورانیّت سے معمور ہُوا کرتا ہے، وہ عامۃ النّاس کے خواب کی طرح نہیں ہوتا کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے، وہ حقیقت بن کر سامنے آتا ہے جس کی کئی مثالیں قرآنِ حکیم میں موجود ہیں، یعنی پیغمبرانہ خواب وحی کا ایک حصّہ ہوا کرتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے فرزندِ

جگر بند حضرت اسماعیل علیہ السّلام کو قربان کردینے کا تہیّہ خواب ہی کی بنیاد پر کر لیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ نے اسے امرِ خداوندی کا درجہ دیا تھا (۳۷/۱۰۲)

مومنین کا خواب دو قسم کا ہوتا ہے، کبھی اعلیٰ سطح کا اور کبھی ادنیٰ سطح کا ہوتا ہے، یعنی اہلِ ایمان کے اچھّے خواب اسمِ بشیر (خوشخبری دینے والا) کے تحت ہیں اور بُرے خواب نذیر (ڈرانے والا) کے تحت ہیں اور نورِ نبوّت کے یہ دونوں نام روحانیت میں فعلاً باقی ہیں۔

خواب کی اچھائی اور بُرائی کا دار و مدار اعمال پر ہے، کیونکہ خواب ایک چھوٹی سی قیامت ہے، جو ہر روز نیند کی حالت میں برپا ہو جاتی ہے، تاکہ ہر شخص اپنے آپ کو دیکھے کہ وہ ایک بڑی اور حتمی قیامت کے لئے تیار ہے یا نہیں، قرآنی ارشاد ہے:۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ (۷۵/۱۴) بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے۔ بصیرت دل کی بینائی یعنی مشاہدۂ باطن کو کہتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جسمانی موت سے پہلے ہی اپنی روح اور اس کے تمام حالات کو دیکھ سکتا ہے اور اس کی ایک چھوٹی سی مثال خواب ہے، اس آیۂ کریمہ میں لفظ "نفس" سے روح مراد ہے، کوئی شخص روحانیت میں یا کم از کم خواب میں جو کچھ دیکھتا ہے، وہ اس کی روح اور خودی ہے۔

دنیا کے سکّۂ رائج الوقت کو دیکھنے کے لئے کہ کھرا ہے یا

کھوٹا کوئی کسوٹی کوئی معیار ہوا کرتا ہے، موٹر جیسی مشینوں میں سائنس دانوں نے مختلف قسم کے میٹر لگا دیئے ہیں، تاکہ رفتار، حرارت ایندھن وغیرہ کا علم ہوتا رہے، اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ خلقتِ انسانی کی تعریف کرے اور اس کے اعمالِ نیک و بد کو پرکھنے کے لئے کوئی معیار ہی نہ ہو، حق بات تو یہ ہے کہ صانعِ حکیم (یعنی خدا تعالیٰ) نے نہ صرف دین کے ظاہر میں بلکہ انسان کے باطن میں بھی ایک فرقان کو مقرر فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:-

اے ایمان والو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لئے "فرقان" مقرر کریگا (۸/۲۹) فرقان ظاہر میں امام عالیمقامؑ کی پاک شخصیت ہے اور باطن میں اس کا نور۔

خواب عالمِ روحانی کی مثال ہے، اس لئے وہ زمان و مکان سے بالاتر ہے، یعنی عالمِ خواب اس مادّی دنیا سے الگ تھلگ ہے اور اس میں جو وقت ہے وہ دنیا کے شب و روز سے وابستہ نہیں، بلکہ وہ آخرت کے وقت کی طرح قانونِ "کُن" کے معجزات و ظہورات سے متعلق ہے، جیسے خیال میں آپ جس موسم کو جس چیز کو یا شخص کو یا جس مقام کو دیکھنا چاہتے ہیں، وہی آپ کے تصوّر میں آتا ہے، ہر چند کہ شروع شروع میں بہت کم روشنی ہوتی ہے یا صبحِ کاذب کی طرح ہوتی ہے، لیکن آخرکار صبحِ صادق بھی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا پاک فرمان ہے: وجعلنا نومکم

سُبَاتاً (۹/۲۷) اور ہم نے نیند تمہارے لئے (موجب) آرام بنایا۔ یعنی عوام کے لئے نیند اور خواص کے لئے روحانیت، کیونکہ نَوْمُ ادنیٰ درجے میں خوابِ غفلت بھی ہے اور اعلیٰ درجے میں روحانیت بھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ نیند خدا کے دوستوں میں روحانیت بن جاتی ہے۔

سورۂ فرقان (۲۵/۴۷) میں ہے: وھو الّذی جعل لکم الّیل لباساً وّالنّوم سُباتاً وجعل النّھار نُشُوراً (۲۵/۴۷) اور (خدا) وہی تو ہے جس نے رات کو تمہارے لئے پردہ اور نیند کو آرام بنایا اور دن کو اُٹھ کھڑے ہونے کا وقت ٹھہرایا۔ اہلِ روحانیت یعنی حدودِ دین سے فرمایا گیا ہے کہ ابتدا میں باطن کو تمہارے لئے پردہ بنایا، جس میں تم نے روحانیّت کا کمال حاصل کر لیا، اور پھر تم کو علمی طور پر ظاہر ہونے کا موقع عنایت کیا، جس میں تم پھیل جاتے ہو۔

سورۂ روم میں ارشاد ہے (۳۰/۲۳): ومن اٰیٰتہٖ منامکم بالّیلِ والنّھارِ وابتغاؤکم مّن فضلہٖ اِنّ فی ذالک لاٰیٰتٍ لّقومٍ یّسمعون (۳۰/۲۳) اور اسی کے نشانات میں سے ہے تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کا تلاش کرنا۔ جو لوگ سنتے ہیں اُن کے لئے ان میں نشانیاں ہیں۔ رات کی نیند سے ابتدائی رُوحانیت مراد ہے جو

پردۂ باطن میں پوشیدہ ہوتی ہے، دن کی نیند کا مطلب آخری روحانیت ہے جو علم کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اس وقت خدا کے فضل یعنی خزینۂ عقل سے علم و حکمت کی تلاش ضروری ہوتی ہے اس میں گوشِ ہوش سے سننے والوں کے لئے معجزات ہی معجزات ہیں۔

سورۂ زمر (۳۹/۴۲) میں فرمایا گیا ہے: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا ج فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۳۹/۴۲) خدا لوگوں کی (نفسانی اور جسمانی) موت کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں (ان کی روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن روحوں پر موت واقع ہو جاتی ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لئے بھیج دیتا ہے، جو لوگ فکر کرتے ہیں، ان کے لئے اس میں نشانیاں (معجزات) ہیں۔

اس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ جو مومن عبادت و ریاضت کے وسیلے سے مکمل نفسانی موت میں مر جاتا ہے اس کی روح بدن سے فارغ ہو کر بہشت میں داخل ہو جاتی ہے، نفسِ مطمئنہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے خواہ شخص زندہ ہو یا مر گیا ہو (۸۹/۲۷-۳۰) اگر وہ مومن ایک نئی روح میں زندہ رہتا ہے، اور جو شخص جسمانی موت سے مر

جاتا ہے، وہ تو مر جاتا ہے، اسی طرح دونوں قسم کی روحوں کو خدا آخرت میں رکھتا ہے، اور جو لوگ کسی طرح سے بھی نہیں مرے ہیں ان کی روحیں نیند یا ابتدائی روحانیت میں قبض کر لی جاتی ہیں اور پھر واپس بھیجی جاتی ہیں، اور یہ عمل ایک مقرّر وقت تک ہوتا رہتا ہے۔

خواب میں صرف اپنی روح ہی ہے جو ایک کائنات بن کر سامنے آتی ہے، جس میں سب کچھ ہے، اُس میں قیامت بھی ہے، اعمال نامہ بھی، بہشت بھی، دوزخ بھی، فرشتے بھی، اُمید بھی، خوف بھی، روشنی بھی اور ظلمت بھی، غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ خواب کو روحانیت اور آخرت کا نمونہ بنایا ہے، تاکہ ہوشمند مومنین اس کی بے شمار حکمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

خواب کی جو تعبیر عام کتابوں میں درج ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ خواب کی تاویل ہے، جو ربّانی چیز ہے، وہ لدنّی علم میں شامل ہے، تاہم اس کے بہت سے اشارات ایسے بھی ہیں جو عام فہم ہیں، جن سے آدمی اپنے اعمالِ نیک و بد کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے، اسی لئے یہ کہنا درست ہے کہ خواب کی دنیا حکمتوں سے بھرپور ہے یہ ایک زندہ اور بولنے والی کتاب ہے، جو ہر درجہ کے لوگوں کو ان کے فہم کے مطابق نصیحت کرتی ہے۔

خاکپائے مومنین
نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی
۲۶ر اپریل ۱۹۸۴ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

یکجان بہت سے قالب

میرے بہت ہی عزیز، پیارے اور دوست فرشتے رفیق جنّت علی اور امین عبدالملک ہمیشہ شاد و آباد رہیں!

میں لازوال محبت اور بھرپور صداقت سے آپ دونوں عزیزوں اور دیگر تمام عزیزوں کو یا علی مدد کہتا ہوں، خداوندِ قدّوس جملہ جان نثاروں کے حق میں یہ پاک دعا قبول کرے! آپ دونوں کے خط کتنے پیارے تھے! اور مجھے انتظار بھی ایسا ہی تھا، مجھے بے حد خوشی ہوئی، ربّ العزّت آپ سب کو علم کی برتری عنایت فرمائے! آپ ہر وقت قربانی اور جان نثاری سے کام لے کر خانۂ حکمت کی خدمت انجام دیتے ہیں، اور اسی طرح الامین اور عارف بھی بڑے جان نثار ہیں، میرا مقصد خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کے چاروں سیکریٹریوں کا ذکرِ جمیل ہے، کہ یہ میرے عزیزان بڑے پیار سے آپس میں مل کر کام کرتے ہیں اور اتفاق و اتحاد کے باب میں ہمارے دونوں مقدّس اداروں کے عملداران اور ممبران بے مثال ہیں۔

یونانی طبّ کے اکثر نسخوں (PRESCRIPTIONS) کے

مطابق کئی جڑی بوٹیوں کو کھرل میں دیر تک پیس پیس کر یک جان بنا لیتے ہیں، پھر ایسی مرکّب دوا کے رنگ و بو، ذائقہ اور تاثیر کا تجزیہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے، اس مثال سے کہیں بڑھ کر ہم سب مونوریالٹی کی کھرل میں یک جان ہو گئے ہیں، اگرچہ ظاہر میں ہماری انفرادیت نظر آتی ہے لیکن باطن میں یہ انفرادیت ایک وحدت میں بدل گئی ہے۔

مثال کے طور پر ہم میں سے ہر شخص ایک جڑی یا بوٹی ہے، اور تمام جڑی بوٹیوں (یعنی ہم سب کی ارواح) کو کھرل کر کے ایک کر دیا ہے، پھر اس سفوف (پوڈر) سے جس میں بہت ساری جڑی بوٹیاں شامل ہیں، ہم میں سے ہر ایک کو ایک پوٹلی دی گئی ہے، اس طرح ہر پوٹلی میں تمام جڑی بوٹیوں کے نمونے ہیں، یعنی ہر ایک روح میں ساری ارواح کے ذرّات موجود ہیں۔

دوسری مثال: ایک ہزار شیشیوں میں ایسا عطر بھرا ہوا ہے جو ایک ہزار قسم کے مختلف پھولوں سے کھینچا گیا ہے، یہ سارا عطر ایک بڑے برتن میں ملایا جاتا ہے، پھر دوبارہ ان سب شیشیوں میں بھر دیا جاتا ہے، اب ہر شیشی میں ایک ایسا عطر ہے، جس میں ہزار نمونے یکجان ہو گئے ہیں، یہ روح کی مثال ہے، کہ اس میں سب روحوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔

تیسری مثال: قرآنِ مقدس اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے

کہ شہد کی مکھیوں کے شہد بنانے میں قدرت کی عجیب و غریب نشانیاں ہیں، وہ لاتعداد پھلوں اور پھولوں کو جو رنگ و بو اور ذائقہ میں الگ الگ ہوتے ہیں اپنے پیٹ میں معجزانہ طور پر یکجان اور شہدِ شیریں بنالیتی ہیں، اگر اس شہد کے ہزار حصّے بنائے جائیں اور پھر پس منظر کا تصوّر کیا جائے تو ہر حصّے کا ایک جیسا قصّہ ہوگا، یعنی وہی باغ و گلشن، وہی پھل پھول، اور وہی لاتعداد شہد کی مکھیوں کی کارکردگی، یہ احوالِ روح کی یکسانیت کی مثال ہے۔

قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ روحوں کے پھیل جانے اور پھر یکجا یا جمع ہو جانے کا ذکر ملتا ہے، جیسے نشر (بکھیرنا) اور حشر (جمع کرنا) جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم روئے زمین پر رہو سہو، پھر جب آخرت (یعنی روحانیت) کا وعدہ آجائے گا، تو تم سب کو جمع کر کے لے آئیں گے (۱۷/۱۰۴) جب حضرت موسیٰؑ کا دین ہر جا تھا تو اس وقت بنی اسرائیل کے مومنین سے فرمایا گیا تھا کہ تم حدودِ دین کے توسّط سے کُرۂ ارض کے بارہ جزیروں میں پھیل جاؤ، پھر وقت آنے پر ہم تم کو لفیف (۱۷/۱۰۴) کر کے لے آئیں گے۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۳۰ ر اپریل ۱۹۸۴ء

روحانی محبّت وحدت کی علامت

میرے بہت ہی عزیز غلام رسول ایم۔ایچ۔نائب صدر برانچ خانۂ حکمت گلگت، میری قلبی یا علی مدد اور بہت سی دوسری دعائیں قبول ہوں! اسی طرح میں تمام عزیزوں کا بھی دعاگو ہوں، خداوند اپنی بے پناہ رحمت سے جملہ جماعت کو سُکھی سلامت رکھے!

میں، آپ سب عزیزوں کی دعا سے بخیر و خوبی اُسی دن رات کے نَو بجے کراچی گھر پہنچ گیا تھا، یہاں بفضلِ مولا ہر طرح سے خیریت ہے، خانۂ حکمت کے عملدار اور ارکان ایک سالگرہ کی تیاری کر رہے ہیں، انہوں نے گلگت برانچ کو خط لکھا ہوگا۔

مجھے وہاں اور ہونزہ میں آپ تمام عزیزوں کے ساتھ ہر گونہ ہمنشینی میں بے حد مسرّت و شادمانی حاصل ہوئی، جب میں ایسی مجالس میں ہوتا ہوں تو یہ میری زندگی کا بہترین وقت ہوتا ہے، عزیزوں کو بے حد عزیز رکھنے کا عظیم راز صرف میں جانتا ہوں اور صرف میرے عزیزان، دراصل یہ راز خزانۂ خداوندی سے ایک بہت بڑے انعام کے طور پر عنایت ہوا ہے، لوگوں کی اس آسمانی سزا کے برعکس کہ اُن کے دلوں میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے، حالانکہ مومنوں سے دشمنی

کرنا بہت بڑا گناہ ہے، ہمیں شکر گزار ہونا چاہیئے کہ آپس کی نااتفاقی کی بیماری سے ہم کو دُور رکھا گیا ہے، الحمد للّٰہ علیٰ منّہٖ واحسانہٖ۔

آپ حضرات نے اپنی ذات میں جذبۂ خدمت کے علاوہ (ساتھ ساتھ) بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی پیدا کر لی ہیں، اب زیادہ سے زیادہ علمی طور پر آگے بڑھنا ہے، مجھے یقین ہے کہ ہر جگہ میرے عزیزوں کی ترقی علم و عبادت کی بدولت ہو رہی ہے، مگر اصل وجہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ اس بہانے سے ہمارے عزیزوں سے کوئی خدمت کروانا چاہتا ہے، کیونکہ مقاصد کی سیڑھی کا آخری اور بلند ترین زینہ جماعت کی خدمت ہے۔

جب کوئی ہوشمند مومن ازل کا تصوّر کرتا ہے تو وہ سرچشمۂ حیات میں تمام ارواح کو ایک پاتا ہے، ہر چند کہ آج بنظرِ ظاہر بے شمار لگتی ہیں، مگر یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا ازل انتہائی بعید ماضی کا نام ہے؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ ازل مرتبۂ عقل یعنی مقامِ عقل کا نام ہے جو مراحلِ روحانیت کے بعد آتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ازل میں یعنی مقامِ عقل پر جو باطن کا باطن ہے، ایک ہیں یا ایک ہے، اسی حقیقت کو سمجھانے کی خاطر جماعتی روح کا تصوّر پیش کیا گیا ہے، پس یہ کیسی عجیب و غریب اور مسرّتوں سے بھرپور بہشت ہوگی، جبکہ ہم سب جماعتی روح میں زندہ ہو جائیں گے، بلکہ نفسِ واحدہ میں ایک ہو جائیں گے، پس دوستو!

جماعت کو اپنی بکھری ہوئی روح سمجھ لیجئے اور جان و دل سے اس کی خدمت کیجئے۔

یہ تو آپ جان چکے ہیں کہ روح ذرّات پر مشتمل ہے، مگر سوال ہے کہ کیوں؟ اور کس لئے ایک ہی روح کے لاتعداد اجزاء ہیں؟ اس لئے کہ ہر چیز پہلے حدِّ قوت میں ہوا کرتی ہے پھر اس کے بعد حدِّ فعل میں آتی ہے، چنانچہ ہر شخص کی روح آج بحدِّ قوّت ایک کائنات ہے اور کل بحدِّ فعل ایک کائنات بن جائے گی، اس حقیقت کی مثال ایک دانۂ گندم ہے، جس میں اضافے کی ایسی اور اتنی صلاحیّت موجود ہے کہ ہے تو فی الحال ایک ہی دانہ، مگر چند سال کے اگانے سے یہ سطحِ زمین پر محیط ہو سکتا ہے۔

روح کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ کثرت و وحدت دونوں کی حامل ہے، کثرت اِس معنیٰ میں کہ وہ اپنی ذات اور ذرّات میں سب کی نمائندگی کرتی ہے اور وحدت اس لئے کہ وہ دراصل ایک ہی ہے، سو یہ کتنی اچھی بات ہے کہ روح وحدتِ خداوندی کی تصویر بھی ہے اور عالمِ کثرت کا عکسِ تنویر بھی، اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ روح سب کچھ ہے۔

فقط مومنین کی خاکپا
نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی

۹ ر مئی ۱۹۸۴ء

ایک سب۔ سب ایک

عزیزِ من صدر فتح علی حبیب! آپ کو ربّ العزّت دونوں جہان کی کامیابی اور سرفرازی عنایت فرمائے آمین یا ربّ العٰلمین!

میرے بے حد عزیز اور پیارے دوست کے بابرکت نام (فتح علی) میں ایک بہت بڑی اور شاندار روحانی اور علمی فتح وکشائش کا معنوی اشارہ موجود ہے، الحمد للہ۔ آپ کی پاکیزہ روح یقیناً میرے حق میں فتح ونصرت کا فرشتہ ہے، اس احسانِ خداوندی سے مجھ پر واجب ہوتا ہے کہ میں بار بار سجدۂ شکرانہ ادا کرتا رہوں۔

یہ ہم سب کی کتنی بڑی سعادت ہے کہ آپ کے لگائے ہوئے پودے حسن وخوبی سے پھلنے پھولنے لگے ہیں، اور جن پھولوں کے بیج بوئے تھے، وہ اب بفضلِ خدا رنگ وبو کی ایک خوبصورت دنیا بن گئے ہیں، یہ مثال ہمارے ان عزیزوں کی ہے جو آپ کی بنیادی اور علمی کوششوں اور عظیم قربانیوں کے نتیجے

میں تیار ہوئے، جن میں سے ہر ایک میوۂ علم کا باغ بھی ہے اور گلِ حکمت کا گلشن بھی، صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے دانشمندی اور سعی پیہم سے کئی ہوشمند سرپرست اور بابصیرت عملدار بھی بنا دیئے، ان تمام عظیم احسانات کے لئے میں آپ کا شکرگزار اور ممنون ہوں۔

آپ خانۂ حکمت کے صدرِ عالیقدر ہیں اور اس کے سینئر سرپرست بھی، لہٰذا اس نیک نام ادارے کی تمام تر کامیابی کا سہرا آپ کے سر ہے، خواہ عمدہ خدمت کوئی بھی کرے، لیکن کسی بھی ادارے کے صدر کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور خاص کر آپ کو کہ آپ مُربّی بھی ہیں، ہر کامیاب ادارے کا مُربّی (پیٹرن = سرپرست) شفیق و مہربان باپ کی طرح ہوتا ہے اور واقعاً آپ نے ایک عظیم باپ کی سی خدمات اور قربانیاں انجام دی ہیں، اور کئی عزیز عملدار اور جان نثار ممبران آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

میرا یقین ہے کہ خدا و رسولؐ اور امامِ زمانؑ آپ اور آپ کی فرشتہ سیرت بیگم گُلِ شکر سے بہت ہی راضی ہیں، جس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ آپ کو جو خدمت دی گئی ہے، وہ بے مثال ہے، اس لئے کہ یہ خدمت غیر محدود اور ہمہ رس ہے، کیونکہ یہ علمی خدمت ہے، جو زمین و زمان پر محیط ہوسکتی ہے۔

یہاں پر یہ ایک سوال اٹھتا ہے کہ اسلام دوسروں کی خدمت کا حکم کیوں دیتا ہے؟ اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ دوسروں کی خدمت کرنا در اصل اپنی خدمت کرانا ہے، کیونکہ بہشت میں مرتبۂ وحدت (مونوریالزم) پر فائز ہو جانے کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ دنیا میں ہماری روح تمام لوگوں کا مجموعہ تھی، لوگ ہماری روح کے اجزاء (ذرّات) تھے، اور یہی تصوّر قرآنِ پاک کا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:-

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (۲/۲۱۳) تمام لوگ پہلے ایک ہی اُمّت تھے (یعنی ایک ہی شخص کے ذرّاتِ روح تھے) جس کی ایک واضح مثال حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے دی گئی ہے کہ: اِنَّ ابراھیم کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِلّٰہِ (۱۶/۱۲۰) بیشک ابراہیمؑ (اپنی روح کے ذرّات میں) خدا کے لئے ایک فرمانبردار اُمّت تھے۔

اسی طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ اقدس میں تمام اہلِ عالم ایک ہوئے ہیں، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (۱۱۰/۲) (اور (جب) آپ تمام لوگوں کو جوق جوق خدا کے دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھیں۔ ناس سے ارواحِ خلائق مراد ہیں، اور دینِ خدا رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس ہے، اس کا مطلب یہ ہے

کہ دنیا کے سب لوگ غیر شعوری طور پر بصورتِ ذرات حضرت محمد مصطفےٰ سرورِ انبیاءؐ کی مبارک ہستی میں داخل ہو گئے تھے، اور اسی کو کہتے ہیں:

"ایک میں سب، اور سب میں ایک"۔

آپ کا دُعاگو

نصیرُالدین نصیرؔ ہونزائی

۱۳ رمئی ۱۹۸۴ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

علمی خدمات کی لذّتیں

میرے دل کے بہت ہی عزیز اور روح کے بہت ہی پیارے محمد عبدالعزیز سرپرستِ خانۂ حکمت اور صدرِ ادارۂ عارف کو خداوند دونوں عالم میں نوازے!

میں امام شناسی کی روشنی میں صمیمیّتِ قلب سے یا علی مدد کہتا ہوں، قبول ہو! عزیزِ من! اس بندۂ ناچیز کو آپ ایسے مولا کے پیارے پیارے روحانی بچّوں سے فدا ہو جانا چاہیئے جو حقیقی علم کے شیدائی اور عاشق ہیں، جو اس علم کو ایک طرف سے حاصل کرتے ہیں اور دوسری جانب سے پھیلاتے رہتے ہیں، ان فرشتہ صفت پاکیزہ انسانوں کو روحانی علم کی گوناگون لذتیں اور مسرّتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ یقیناً آپ اور آپ کی نیک بخت اہلیہ جن کی روح معجزاتی ہے، انہی اعلیٰ مومنین کی صفِ اوّل میں ہیں۔

مجھ خاکسار پر اور میرے ناچار قلم پر آپ عزیزان کے اتنے زیادہ احسانات ہیں کہ میں نہ تو اُن کا احاطہ کر سکتا ہوں اور نہ ہی شکریہ ادا کر سکتا ہوں اور سوائے ایک عاجزانہ دعا کے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں کہ: خداوندا! تجھ سے یہ حالت پوشیدہ نہیں کہ میں

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science

انتہائی مفلس ہوں، میں اپنے عزیزوں کو کچھ نہیں دے سکتا، اے بے پایاں خزانوں کا مالک! تو ہی اپنی بے پناہ رحمت سے انہیں دین و دُنیا کی کامیابی اور سرفرازی عنایت فرما! آمین!!

عقلی، علمی اور روحانی لذتوں کے متعلق راز کی بات یہ ہے کہ ان کا ادراک و احساس تقویٰ کی بنیاد پر ہوتا ہے، چنانچہ جو شخص جس قدر متقی ہو، اس کو اس قدر عقل، علم اور روح کی لذّت و مسّرت حاصل ہو جاتی ہے اور یاد رہے کہ علمی حلاوت و شادمانی نہ صرف علم کی باتوں کے سننے میں محدود ہے بلکہ علم کو فروغ دینے سے متعلق ضروری خدمات اور قربانیوں میں کہیں زیادہ لذّت و خوشی ہے۔

جس طرح ظاہری اور مادّی لذّتوں سے صرف ایک تندرست انسان بھرپور حظ اٹھا سکتا ہے اور بیمار آدمی اس سے محروم ہے، اسی طرح باطنی اور روحانی لذّتوں کا لطف صرف اہلِ تقویٰ ہی کو ملتا رہتا ہے، اور جو پرہیز گار نہیں وہ گویا بیمار ہیں، لہٰذا وہ باطنی حلاوتوں سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔

قرآنِ حکیم کے تین مقامات (۴۳/۷۱، ۳۷/۴۶، ۴۷/۱۵) میں بہشت کی لذّتوں کا ذکر ہے، یہ سب لذّتیں لطیف اور باطنی نوعیت کی ہیں، اور عقل و روح سے متعلق ہیں، کیونکہ جنّت میں ایک ابداعی جسم ملتا ہے، جس کی ایک پاک روح اور ایک کامل عقل ہوتی ہے،

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

چنانچہ جسمِ لطیف کی لذّتیں دنیا کی تمام لذّتوں سے اعلیٰ ہیں، روحِ مقدّس اور عقلِ مکمّل کی لذّتیں اس سے بھی برتر ہیں۔

کوکبی بدن یعنی جسمِ لطیف کی لذّتوں کے بارے میں ارشاد ہے: وَفیھا ما تشتھیہِ الانفس ۴۳/۷۱ اور اُس (بہشت) میں وہ چیزیں ہیں جو نفوس چاہیں گے۔ روحانی لذّتوں کے باب میں یوں فرمایا گیا ہے: وَ تَلَذُّ الاعینُ (۴۳/۷۱) اور وہ چیزیں ہیں جن سے آنکھوں کو لذّت ہوگی۔ یہاں نفس کا اشارہ جسمِ لطیف کی طرف ہے اور عین (آنکھ) کا مطلب چشمِ باطن ہے جس سے روح مراد ہے۔

اسی طرح عقلی لذّتوں کے متعلق فرمانِ خداوندی ہے: یُطافُ علیھم بکاْسٍ مِّن مّعین (۴۵/۳۷) بیضاءَ لَذّةٍ لِّلشّٰرِبین (۴۶/۳۷) اور ان کے پاس ایسا جامِ شراب گردش میں ہوگا جو بہتی شراب سے بھر جائے گا (شراب) سفید ہوگی پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی۔ یہاں عقل کے مظاہرۂ فعل کی تشبیہ جامِ شراب کی گردش سے دی گئی ہے بہتی ہوئی شراب سرچشمۂ عقل کی مثال ہے اور سفید رنگ پہچان کی علامت ہے۔

خاکپائے جماعت
نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی
۱۴ ر مئی ۱۹۸۴ء

کشتیٔ علم

میرے قلب و روح کے بہت ہی عزیز اور جان کی طرح پیارے نصر اللہ نائب صدر خانۂ حکمت کو خداوند ہر طرح کی کامیابی اور سلامتی عنایت فرمائے!

انتہائی خلوص، پاک دلی اور روحانی محبّت سے بھرپور یاعلی مدد قبول ہو! میرے جانی اور جگری دوست نصر اللہ! آپ کے اس پیارے نام (نصر اللہ) کے لفظی معنی میں خدا کی مدد کا ذکر واضح ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ واقعیّت وحقیقت خانۂ حکمت میں زیادہ سے زیادہ روشن ہے، کیونکہ اس میں آپ نہ صرف وائس پریزیڈنٹ کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ آپ اس کے پیٹرن بھی ہیں، لہٰذا آپ ہمارے اس ادارے کے لئے واقعاً "خدا کی مدد" ہیں، الحمد للہِ ربّ العالمین۔

جب خداوند تعالیٰ کسی بندۂ مومن کو ایک ہمہ گیر دینی خدمت میں کامیاب بنانا چاہتا ہے تو وہ اس کے تمام دوستوں کو نیکی کے فرشتے بنا دیتا ہے، تاکہ وہ اس پاک و پاکیزہ خدمت میں ممدّو معاون ثابت ہو جائیں، پروردگارِ عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ میرے

عظیم فرشتوں میں سے ہیں۔

"سالی کہ خوش است از بہارش پیداست"۔

جو سال اچھا ہو اس کی علامت بہار ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے، اب سے چند برس پہلے آپ کی اور میری مذہبی دوستی بڑے اعتماد سے شروع ہوئی تھی، مجھے اس عظیم نعمت کے لئے محترم فتح علی حبیب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ اور ہماری عزیز بیٹی امینہ روحانی علم کے بڑے قدر دان ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ اس علم کو پھیلانے کی خاطر بڑی بڑی قربانیوں سے کام لیتے ہیں، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ علم کی روشنی عام کر دینا سب سے بڑی نیکی اور سب سے عظیم ثواب ہے، جیسا کہ بموجب حدیثِ شریف اُمّت کے ہر زیرک و عاقل پر چار چیزیں لازم ہیں: علم کا سُننا، اس کا حفظ کرنا، اس پر عمل کرنا، اور اس کو پھیلانا۔

ارشادِ نبوی ہے: منزلۃُ أھل بیتی فیکم کسفینۃِ نوحٍ، من رکبھا نجا ومن تخلّف عنھا غرق۔ وقال: تعلّموا مِن عالمِ اھل بیتی، ومن تعلّم مِن عالم أھل بیتی نجوا من النّار = میرے اہلِ بیت کی منزلت تم میں کشتیٔ نوحؑ کی طرح ہے، جو اسمیں سوار ہُوا اس کو نجات ملی اور جس نے اس سے مخالفت کی وہ غرق ہو گیا، اور

ارشاد فرمایا: میرے اہلِ بیت کے عالم (یعنی امامِ زمان) سے علم سیکھو، اور اس شخص سے علم سیکھو جس نے میرے اہلِ بیت کے عالم سے علم حاصل کیا ہو، تاکہ تم آگ سے بچ جاؤ گے۔

یہ حدیثِ شریف زبانِ حکمت سے یوں بتاتی ہے کہ اہلِ بیت رسولؐ (یعنی امامِ وقتؑ) نہ صرف زمانۂ نبوّت میں کشتیٔ نوحؑ کی مثال ہیں بلکہ یہ بات ہر زمانے کے لئے ہے، کیونکہ طوفانِ جہالت ہر وقت موجود ہے، چنانچہ کشتیٔ نوح میں سوار ہو کر نجات حاصل کرنا یہ ہے کہ اہلِ بیت کے عالم (امامِ وقتؑ) سے علم حاصل کیا جائے یا ایسے افراد سے علم سیکھا جائے جن کو امامؑ نے مقرر فرمایا ہے، تاکہ آتشِ نادانی سے رُستگاری ملے۔

یہاں اگلی حدیث کی وضاحت پچھلی حدیث سے کی گئی ہے، جس سے صاف طور پر ظاہر ہوا کہ وہ طوفان جو ہر زمانے میں پایا جاتا ہے، جہالت و ضلالت کا ہے، اور اس سے بچنے کے لئے کشتیٔ نجات علم و ہدایت کی ہے، جس کا سرچشمہ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں، پس حقیقی علم کی روشنی میں امامِ عالیمقامؑ سے وابستگی ہر طرح کی نجات کی ضمانت ہے۔

خاکپائے مومنان
نصیر الدّین نصیر ہونزائی
۱۴ مئی ۱۹۸۴ء

ذکرِ جلی

میرے قلبی عزیز اور روحانی دوست محیّ الدّین سرپرست اور نائب صدر ادارۂ عارف کو خداوند دونوں جہان کی کامیابی عطا فرمائے! آمین!!

میں انتہائی خلوص اور درویشانہ عاجزی سے یا علی مدد کہتا ہوں پروردگار ایسی ہی دعائیں تمام عزیزوں کے حق میں قبول فرمائے!
اس بندۂ خاکسار پر ربِّ عزت کا ایک خاص احسان یہ بھی ہے کہ آپ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اس دینی علم کی طرف مکمل توجہ دے رہے ہیں، اور فروغِ علم کے سلسلے میں بھرپور تعاون کر رہے ہیں۔
میرے فرشتہ صفت دوست! یہ آپ کی بہت بڑی خوش بختی ہے کہ آپ کا ماحول روحانی علم سے مملو ہے، قرآنِ حکیم کی گہری حکمتیں، روحانیت و معرفت کی باتیں، اور ذکر و تسبیح، یہ دولتِ لازوال آپ کو اور آپ کی شریکِ حیات کو آسمانی عطیہ کے طور پر ملی ہے، کسی مومن کے گھر کی ایسی روحانی آبادی خدا کی بہت بڑی رحمت ہے۔

آپ کے بزرگوار دادا قدیر شاہ صاحب ہونزہ کے قریۂ حیدرآباد

ہیں بڑے متقی اور درویش صفت انسان تھے، اُن کو اپنے حلقے میں پیر کی نمائندگی کا درجہ حاصل تھا، کیونکہ وہ اُس زمانہ اور اُس علاقے کی ضروری تعلیم سے آشنا تھے، وہ بڑے عبادت گزار تھے، اور انہوں نے صوفیانہ ذکرِ جلی کا ایک حلقہ قائم کیا تھا، جس میں اکثر صبح و شام رباب و دف کے ساتھ شمسی ذکر یا صوفیانہ ذکر کیا کرتے تھے، میرے ماموں جان یعنی قدیر شاہ صاحب قبلہ کے ساتھ میرے والدِ بزرگوار اور دوسرے کئی بزرگ بھرپور حصّہ لیتے تھے۔

ذکرِ جلی سے متعلق ایک قصّہ یاد آیا، یہ میں نے چین میں سُنا کہ وہاں کچھ صوفیوں کے درمیان مسئلہ "جَہُر" پر پہلے بحث ہوئی تھی، اور پھر ایک دوسرے پر لاٹھی چلانے کی نوبت آئی تھی، حالانکہ جہر (ذکر بآوازِ بلند) سے کسی کو برہم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ متعلقہ آیۂ کریمہ میں اس کا جواز موجود ہے، اور وہ ارشاد یہ ہے :-

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴/۱۴۸) اللہ تعالیٰ بُری بات کو پکار کر کہنا پسند نہیں کرتا بجُز مظلوم کے۔ یعنی اگر ضرورت ہوئی تو یہ صرف کسی مظلوم ہی کے لئے جائز ہے کہ وہ ظالم کے خلاف فریاد و فغاں اور گریہ وزاری کرے، تاکہ اس کی خلاصی یا عدل و انصاف ہو، ہاں ظلم کی ایک اور

صورت بھی ہے، وہ یہ کہ انسان بسا اوقات اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے، جس کے لئے بھی یہی جواز اور چارۂ کار ہے کہ ذکرِ جلی اور گریہ و زاری کی جائے، اور اپنی پیاری روح پر اپنے آپ کو ظالم ٹھہرایا جائے، جس طرح حضرت آدم اور حضرت حوّا علیھما السّلام نے یوں گریہ وزاری کی تھی:-

قالا ربّنا ظلمنا انفسنا وان لّم تغفر لنا وترحمنا لنکوننّ من الخٰسرین (۷/۲۳) دونوں نے کہا کہ اے ہمارے ربّ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور رحم نہ کرے گا تو ہم زیاںکاروں میں سے ہو جائیں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدم و حوّا (علیھما السّلام) کی توبہ کا نمایاں حصّہ ذکرِ جلی اور گریہ وزاری ہے۔

ذکرِ جلی اور گریہ وزاری میں ادب، عاجزی، حیا، ہم آہنگی اور خوش الحانی کی سخت ضرورت ہے، تاکہ یہ ذکر اپنی تمام تر خوبیوں کی وجہ سے معجزنما ہو سکے، اور ذاکرین عجز و انکساری کے سمندر میں ڈوب جائیں، کیونکہ ایسے ذکر میں کوئی فائدہ نہیں، جو بے ہنگم، غیر موزوں، خشک، سطحی، کرخت اور ناخوشگوار ہو۔

خاکِ نقشِ پائے مومنان
نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی
۱۵ مئی ۱۹۸۴ء

فرشتہ بصورتِ انسان

میرے دل کے بہت ہی عزیز، بہت ہی پیارے خان محمد صاحب سرپرست اور چیف ایڈوائزر کو حضرتِ احدیت دونوں عالم کی کامیابیوں اور سلامتیوں سے نوازے!

قلب وروح کی گہرائیوں اور بلندیوں سے یاعلی مدد کی مقدّس و پُرحکمت دعا قبول ہو! اور ایسی بہت سی دعائیں آسمانِ روحانیت کے عظیم فرشتوں سے حاصل ہوں! محترم خان صاحب! آپ نے خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کی بقا و ترقی کے لئے جو جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں، وہ ایک عظیم تاریخ کا حصہ بن رہی ہیں، آپ ہمارے اس علمی کارخانے کے مضبوط ستونوں میں سے ہیں، جو خداوند کی توفیق سے جماعتی خدمت کے پیشِ نظر قائم کیا گیا ہے، ہمارے دونوں اداروں کے عملداران اور ممبران آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں، پاکیزہ عادتوں اور پیاری جماعت کی گوناگون خدمات سے بے حد متأثر ہیں، اور ہر وقت یہ عزیزان آپ کی بے مثال محنت اور عالی ہمتی کی

تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔

کوئی پہچانے یا نہ پہچانے، مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ ایسے حقیقی مومنین بحدِّ قوت فرشتے بصورتِ انسان ہوا کرتے ہیں، اور کل کو انہیں بحدِّ فعل فرشتے ہو جانا ہے، کیونکہ ہر چیز پہلے حدِ قوت میں ہوتی ہے، اور اس کے بعد حدِ فعل میں آتی ہے، اس بات کو سب جانتے ہیں کہ جماد سے نبات بنتی ہے، نبات سے حیوان کا وجود بنتا ہے، حیوان سے انسان کی ہستی بنتی ہے، اور انسان سے فرشتہ وجود میں آتا ہے، یہ عالمِ کبیر کی بات ہوئی اور عالمِ صغیر کا قصہ اس سے بھی زیادہ قابلِ فہم ہے، وہ یوں ہے کہ انسان کو خدا نے کُل کائنات کے نچوڑ سے بنایا ہے، اس لئے اس کے وجود میں بمرتبۂ ادنیٰ جمادات ہیں، جن کی تحلیل سے لاتعداد ارواحِ نباتی بن جاتی ہیں، جن کی تحلیل سے روحِ حیوانی بن جاتی ہے، جو بے حساب حیاتی (زندہ) ذرّات کا مجموعہ ہے جس کے تزکیہ سے انسانی روح بن جاتی ہے، جو بے شمار اجزاء پر مشتمل ہے، جس کے مزید اور اعلیٰ تزکیہ سے فرشتہ بن جاتا ہے، یہ تزکیہ حقیقی علم اور عملِ صالح سے ہوتا ہے اور یہ فرشتہ ایک ہوتا ہے، مگر اس میں سب فرشتے موجود ہوتے ہیں۔

حضرت امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے اپنے ارشاداتِ مقدسہ میں علم و عمل سے مومن کے فرشتہ بن جانے کا ذکر فرمایا ہے، قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں مومنین کی علمی پاکیزگی کا بیان ہے اس میں ان

کے فرشتہ بن جانے کا اشارہ ہے، اس کے علاوہ جن مقامات پر براہِ راست فرشتوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے، اُس میں بھی ارواحِ مومنین کا ذکر ہے۔

فرشتوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ خدا کی عبادت میں انکساری کرتے ہیں، عبادت سے نہیں تھکتے، دن رات تسبیح کرتے ہیں اور نہیں تھکتے (۲۱/۱۹-۲۰) وہ سجدہ کرتے ہیں، اپنے ربّ سے ڈرتے رہتے ہیں، اور جو کچھ حکم ہو اس کو بجا لاتے ہیں (۱۶/۴۹-۵۰) نیز فرشتوں کی ایک خاصیّت حقیقی علم سیکھنا ہے، جیسے قصۂ آدمؑ میں اس کا ذکر ہے (۲/۲۹-۳۲) کیونکہ اِس علم کے بغیر ان کی ہستی کی تکمیل ادھوری رہ جاتی ہے، پس جو نیک بخت مومنین مذکورہ خصوصیات میں فرشتوں کے قریب ہیں وہ آج بحدِ قوت فرشتے ہیں، اور کل بحدِ فعل فرشتے بن جائیں گے۔

انسانِ کامل جسمانی فرشتہ ہوا کرتا ہے، کیونکہ فرشتے کی خاص علامت قربِ خداوندی ہے (۱۶/۴۹) جو انسانِ کامل کو مقرّب فرشتوں سے بھی بڑھ کر حاصل ہے، جس کا ثبوت واقعۂ معراج ہے، کہ اس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جبرائیلؑ کو قربِ خاص سے پیچھے چھوڑا تھا، اس کے علاوہ انسانِ کامل میں تمام فرشتگانہ صفات موجود ہوتی ہیں، اور اس کی ذاتِ بابرکات میں اللہ تعالیٰ کے بزرگ نام شب و روز مسلسل اپنے آپ کو دہراتے اور بولتے

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

رہتے ہیں، اور ہر وقت ارواحِ مقدّسہ کی تسبیح خوانی کی گونج جاری رہتی ہے۔

خاکپائے مومنان
نصیرؔ الدین نصیرؔ ہونزائی
۱۷ مئی ۱۹۸۴ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نوٹ: جو غذا از قسمِ نبات (پھل، سبزی) اور حیوان (یعنی گوشت) کھائی جاتی ہے، وہ پہلے درجۂ جماد میں گر جاتی ہے، اور پھر اس کا ارتقاء شروع ہو جاتا ہے۔

خوشبوؤں کی دُنیا

میرے بہت ہی عزیز یارِ جانی، دوستِ روحانی الامین جائنٹ سیکریٹری خانۂ حکمت کو خداوند دونوں جہان میں عزّت و سربلندی عنایت فرمائے! آمین!

میں بصد خلوص و محبّت آپ اور آپ کے عزیز اہلِ خانہ کو یاعلی مدد کی مقدّس و پُرحکمت دعا کرتا ہوں، نیز اپنے دیگر جملہ عزیزان کے حق میں بھی یہی پاک دُعا کرتا ہوں، ربّ جلیل اسے قبول فرمائے!

میرے بہت ہی پیارے الامین! میرے فرشتہ سیرت علمی دوست! آپ بلاشبہ علم کے بڑے قدردان اور حقیقت شناس ہیں، آپ ہماری عزیز جماعت کے اُن عظیم خادموں میں سے ہیں جو شب و روز علمی میدان میں بڑی جان نثاری سے خدمت کر رہے ہیں، آپ اپنی عمرِ گرانمایہ کے بیش بہا اوقات کا ایک حصہ راہِ علم میں خرچ کر رہے ہیں، الحمد للہ، یہ سب کچھ خداوند تعالیٰ کا عظیم احسان ہے۔

خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف سے جو حضرات وابستہ ہیں، ان

کی مشترکہ خدمات اور گرانقدر قربانیوں کی بدولت جو لطیف علم وجود میں آتا ہے اور جس طرح چار سوئے عالم میں پھیلتا جا رہا ہے، اس کی اہمیّت و افادیت بفضلِ خدا بڑی زبردست ہے، چونکہ یہ حقیقی علم امامِ عالیمقام صلوات اللہ علیہ کا ہے، اس لیے اس کی روشنی دُور دُور تک پہنچ رہی ہے، اور اس کی رسائی کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

اس مادّی دنیا میں جتنے پھول اور پھل ہیں، اُن سب کی خوشبوئیں الگ الگ ہیں، ان کے علاوہ بہت سی جڑی بوٹیاں اور دوسری چیزیں ہیں، جن میں سے ہر ایک میں ایک جداگانہ خوشبو کا خزانہ پوشیدہ ہوا کرتا ہے، اس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایک ہی دُنیا کے اندر بہت سی ذیلی اور طفیلی دنیائیں موجود ہیں، اور اُن میں سے ایک خوشبوؤں کی دنیا ہے، جو بڑی لطیف، بیحد دلکش، بہت دلنواز اور جان پرور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم خوشبو کو پسند فرماتے تھے، اس میں بہت بڑا راز ہے، وہ یہ کہ جنّت (روحانیت) کی جسمانی غذائیں خوشبوؤں کی صورت میں ہیں، کیونکہ اہلِ بہشت کے اجسام کوکبی (آسٹرل) قسم کے ہوا کرتے ہیں، جن کے لئے لطیف غذائیں یعنی خوشبوئیں مقرر ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ایک دانشمند غور کر کے اس حقیقت کو تسلیم

کر سکتا ہے کہ بہشتیوں کا رزق سالم پھل نہیں، بلکہ پھل کا خلاصہ اور جوہر ہے، جس سے خوشبو والی نباتی قوّت مراد ہے، کیونکہ قرآنِ پاک میں اہلِ جنّت کے رزق کے بارے میں "مِن ثَمَرَةٍ رِزقاً (۲۵/۲)" پھل سے رزق" فرمایا گیا ہے، یعنی خود میوہ نہیں بلکہ میوہ سے روح (ست = جوہر) درکار ہے، اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جس طرح خام دنیا تمام میوہ پہلے موجود ہوتا ہے اور اس میں خوشبو والی روحِ نباتی بعد میں آتی ہے، اسی طرح اپنی اپنی لطیف خصوصیات کے ساتھ پھولوں، پھلوں وغیرہ کی ارواحِ نباتی گلشن اور باغ کے بغیر موجود ہو سکتی ہیں، اور آیت کا مشمول بھی یہی ہے۔

علمِ روحانیت کا دوسرا نام علمِ حقائقِ اشیا ہے، جس کے عملی تجربہ کی روشنی میں تحقیق کی گئی ہے کہ انبیا و اولیا کے بعد حقیقی درویشوں کو پھولوں اور پھلوں کے بغیر بھی ان کی خوشبوئیں آتی ہیں، یہ بہشت کی جسمانی نعمت ہے، جبکہ روح اور عقل کی نعمتیں اس سے زیادہ لطیف اور اعلیٰ ہیں، اور یہ بات یاد رہے کہ مومن کو اس دنیا میں ہوتے ہوئے بہشت کی شناخت ضروری ہے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:-

اُولٰٓئِكَ لَهُم رِزقٌ مَّعلُوم (۳۷/۴۱) یعنی یہ لوگ وہ ہیں جن کو جنّت کا رزق پہلے ہی سے معلوم ہے۔ نیز فرمایا: وَیُدخِلُهُمُ الجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُم (۶/۴۷) اور ان کو اس بہشت میں

داخل کرے گا جس کا انہیں (پہلے سے) شناسا کر رکھا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مومنین کی جنّت تمام معنوں کے ساتھ امامِ زمانؑ ہیں، اور اصلی اور اساسی معرفت اسی مقدّس ہستی کی ہے اور تمام ذیلی معرفتیں اسی مرکز اور سرچشمۂ نور کی بدولت میسّر ہو جاتی ہیں۔

نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سورۂ لقمان سے اہم سوالات

میرے بہت ہی عزیز و محترم دوست نورالدّین راج پری جو امریکا میں رہتے ہیں، جو دینی علم کے بڑے دلدادہ ہیں، آپ اکثر اوقات اپنے عزیز دوستوں کے ساتھ ملکر اسماعیلی تعلیمات کا باقاعدگی اور شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس ایٹمی دور میں اور خاص کر امریکا جیسے عظیم ملک میں جہاں گوناگون مادّی ترقیوں کا طوفان برپا ہو چکا ہے، ہر مومن کے پاس حقیقی علم کا ہونا ازبس ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ اور آپ کے رفقاء وقتاً فوقتاً تحریری سوالات بھی کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس دفعہ سورۂ لقمان (۳۱) سے متعلق بڑے اہم سوالات کئے ہیں۔

اس سلسلے میں بندۂ کمترین نصیر الدّین جو خود کو خاکِ پائے مومنین سمجھتا ہے وہ خداوند برحق کی بارگاہِ عالی سے توفیق و تائید طلب کرتا ہے کہ وہی قادرِ مطلق اس ناچیز بندے کی یاری و دستگیری فرمائے! آمین یا ربّ العٰلمین!!

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔

سوال نمبر۱: الٓمّٓ کی تاویل بیان کیجئے۔

جواب: الٓمّٓ حروفِ مُقطّعات میں سے ہیں، اور قرآنِ پاک کے تمام حروفِ مُقطّعات میں حق تعالیٰ نے اپنے مقدّس اور بزرگ ناموں کی قسم کھائی ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ نے الف میں اوّل (قلم) کی قسم کھائی ہے، لام میں لوحِ محفوظ کی اور میم میں مرقوم کی قسم کھائی ہے، پس الف کی تاویل ہے اوّل، یعنی قلمِ الٰہی، جو عقلِ کُلّ ہے، لام سے لوحِ محفوظ مراد ہے جو نفسِ کُلّ ہے اور میم کی تاویل مرقوم (مکتوب) ہے، جسے رقیم بھی کہا گیا ہے، یعنی وہ تحریرِ روحانی جو لوحِ محفوظ میں درج ہے، اسی طرح ربّ العزت نے اپنے تین بزرگ ناموں کی قسم کھائی ہے، اور یہاں یہ اصول بھی یاد رہے کہ مظہرِ قلم (اوّل) ناطقؑ ہیں، مظہرِ لوحِ محفوظ اساسؑ اور مظہرِ رقیم (مرقوم) امامؑ ہیں۔ الٓمّٓ کی مزید تاویلات کے لئے ملاحظہ ہو کتابچہ "پیر ناصر خسرو (ق س) اور روحانیت"۔

سوال نمبر۲: سورۂ لقمان کی دوسری آیت میں جن خاص آیاتِ کریمہ کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ کیا ہیں؟ اور کتابِ حکیم کی تاویل کیا ہے؟

جواب: وہ آیاتِ عظیمہ عالمِ روحانی میں قلم، لوح اور رقیم ہیں، اور عالمِ جسمانی میں ناطقؑ، اساسؑ اور امامؑ ہیں، جن کا اوپر ذکر ہو چکا اور کتابِ حکیم (حکمت والی کتاب) امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں،

Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science

جو خداوند تعالیٰ کی بولنے والی کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔

سوال نمبر ۳ : لفظِ ہدایت، رحمت اور نکوکار کی وضاحت کیجئے، نیز یہ بھی بتا دیجیے کہ ہدایت و رحمت کا تعلق نکوکاروں سے کیوں ہے؟

جواب : ہدایت دین کے بنیادی اور سب سے اہم امور میں سے ہے، لہٰذا یہ سُنّتِ الٰہیٰ سے وابستہ ہے جو بے بدل ہے یعنی اللہ کی ہدایت ہمیشہ ہادیٔ برحق کے توسط سے ملا کرتی ہے، جس کے لئے پہلے تو سلسلۂ نبوّت ہے، اور پھر سلسلۂ امامت، اور ایسی ہدایت کا ہونا رحمت ہے، کیونکہ یہ ہدایت اختلافات اور شکوک وشبہات سے پاک و بالاتر اور یقینی ہے، یعنی خدائے رحمان و رحیم کی جانب سے ہدایت کے لئے ہر وقت ایک زندہ رہنما کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ نورِ قرآن اور ہادیٔ زمان قرار پائے اور ہدایت و رحمت کا تعلق محسنین (نکوکاروں) سے اس لئے ہے کہ محسنین سے فرمان بردار لوگ مراد ہیں کہ وہی حضرات اپنی روح پر احسان کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی احسان کر سکتے ہیں، پس اُن کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

سوال نمبر ۴ : براہِ مہربانی صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے لغوی اور اصطلاحی معنی بتائیں، نیز یہ بیان کریں کہ آخرت پر یقین رکھنے میں کیا تاویل پوشیدہ ہے؟

جواب : صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں دعا، درود، نشوونما دینا، پیروی، اور اصطلاحی معنی ہیں نماز، زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں اور اصطلاح میں زکوٰۃ مال کی وہ مقدار ہے جس کا دینا فرض ہے، نماز کی تاویل دعوتِ حق کو قائم کرنا ہے اور زکات کی تاویل علم دینا ہے، آخرت پر یقین رکھنے کی تاویل ہے امامِ وقت علیہ السّلام کے مرتبۂ روحانیت کو ماننا، اور عین الیقین یا علم الیقین کے طور پر اس حقیقت کا یقین کر لینا۔

سوال ۵ : آیا ہدایت ساری مخلوقات کے لئے یکسان اور ایک جیسی ہے یا یہ بتدریج اور درجہ وار ہے ؟ فلاح پاتے کا واضح مطلب کیا ہے ؟

جواب : ہدایت یکسان نہیں، بلکہ یہ مخلوقات کے درجات کے مطابق بتدریج اور درجہ وار ہے، یعنی یہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کے مختلف طبقات کے مطابق ہے، بالفاظ دیگر ہدایت عام سے عام بھی ہے اور خاص سے خاص بھی، اور کسی گروہ کی سعادت اس بات میں ہے کہ اُس کو خدا کی خاص ترین ہدایت ملے، فلاح کے معنی کامیابی ہیں، جو تزکیۂ نفس سے حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے لئے خصوصی ہدایت کی ضرورت ہے۔

سوال نمبر ۶ : آیت نمبر ۱۰ کے مفہوم کے بارے میں بعض کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے قائم کیا، اس کے

برعکس بعض کہتے ہیں کہ خدا نے آسمانوں کو کچھ ایسے ستونوں پر قائم کیا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، اس میں آپ کا اپنا خیال کیا ہے؟

جواب: یہی قول درست ہے اور آیۂ کریمہ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خدائے پاک نے اس کائنات کو ایسے ستونوں پر قائم کیا ہے کہ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں، کیونکہ اس کائنات کے اجزاء خواہ لطیف ہوں یا کثیف ایک دوسرے کے اوپر اور باہم متصّل ہیں، اور جسمِ کُلّی کی کوئی جگہ جسم یعنی مادّہ سے خالی نہیں، فلکِ محیط کی تمام وسعت ہر قسم کے مادّہ سے بھری ہوئی ہے اور سورج اس مادّی کائنات کا وسط اور مرکز ہے۔

سوال نمبر ۷: سورۂ لقمان میں جس طرح لقمان کا ذکر فرمایا گیا ہے، اسی کی روشنی میں ہمیں بتا دیجئے کہ حضرت لقمان کا کیا درجہ تھا؟

جواب: حضرت لقمان کے بارے میں یہ قرآنی حقیقت روشن ہے کہ آپ کامل اور مکمّل انسانوں میں سے تھے، کیونکہ اللہ پاک نے انہیں حکمت عطا کر دی تھی اور حکمت عقل و دانش کا وہ سرمایہ ہے کہ اس کے حصول کے ساتھ ساتھ خیرِ کثیر بھی مل جاتی ہے، نورِ حکمت کی روشنی میں وہ سب نعمتیں نظر آنے لگتی ہیں جو ربّ کریم نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں، یہی سبب ہے کہ لقمان حکیم پر شکر گزاری واجب کرتے ہوئے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اہلِ حکمت شکر کریں۔

سوال نمبر ۸: ظاہر ہے کہ حضرت لقمان خداشناس اور مُوَحّد

تھے، اسی سبب سے اپنے بیٹے کو شرک کے خلاف نصیحت کرتے تھے، لیکن پوچھنا یہ ہے کہ شرک کس معنی میں ظلمِ عظیم ہوتا ہے؟

جواب: حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں: خدا کے حقوق اور بندوں کے حقوق، اگر کوئی شخص نظریاتی طور پر خداوندِ برحق سے خدائی اور بادشاہی کے حق کو اٹھا کر کسی غیر سے منسوب کرتا ہو تو یہ تصور سب سے بڑا ظلم ہے، ظاہر بات ہے کہ وہ اس ظلمِ عظیم کے تحت اپنے آپ پر بھی ظلم کرتا ہے اور دوسروں پر بھی، اس کے برعکس خداشناسی اور توحید سب سے بڑے عدل کا درجہ رکھتی ہے۔

سوال نمبر۹: سورۂ مذکورہ کی آیت نمبر۱۵ کے ترجمۂ ظاہر کے سمجھنے میں البتہ کوئی دقّت نہیں، مگر یہاں سوال اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جبکہ ہم تاویل کی رو سے اس میں روحانی والدین کی بات شروع کرتے ہیں، یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ روحانی ماں باپ اپنے کسی فرزند کو شرک کرنے کا حکم دیں؟

جواب: سوال بجا اور ضروری ہے، مگر اس کے تحریری جواب میں اسرارِ روحانیت کی کچھ نزاکتیں حائل ہو جاتی ہیں، لہٰذا اس کو کسی وقت کی زبانی گفتگو پر چھوڑ دیتے ہیں، انشاء اللہ آپ عزیزوں میں سے کوئی بھی ملے، تو اس پر بحث کریں گے۔

سوال نمبر۱۰: آیت نمبر۱۶ میں رائی کا دانہ کس چیز کی مثال ہے؟ قرآنی مثالیں ممکنات میں سے دی گئی ہیں یا غیر ممکنات میں سے؟ اگر

آپ کہتے ہیں کہ قادرِ مطلق جس کام کو دائرۂ امکان میں دکھاتا ہے، وہ کسی بھی صورت میں انجام پاتا ہے، تو پھر آپ ہمیں یہ بتادیں کہ اللہ تعالیٰ چٹانوں، آسمانوں اور زمین سے رائی کے دانہ کے برابر کسی چیز کو کس طرح حاضر کرتا ہے؟

جواب: اس آیۂ مقدسہ میں رائی کا دانہ ذرّہ روح کی مثال ہے، قرآنِ پاک کی جو جو مثالیں امکانی تصور میں پیش کی گئی ہیں، وہ ظاہراً یا باطناً وقوع پذیر ہونے والی چیزیں ہوا کرتی ہیں، اور اسی طرح قرآنِ حکیم کی تمام تر حکمت ایسی ہی مثالوں میں پوشیدہ رہتی ہے، چنانچہ آیۂ کریمہ کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ خداوندِ عالم روزِ قیامت کائنات بھر کی چیزوں کی روحوں کو بصورتِ ذرات حاضر کرے گا، اور اس میں پتھر کا ذکر نمایاں اس لئے کیا گیا ہے کہ لوگ اسے روح سے خالی مانتے ہیں، حالانکہ اس میں بھی ایک قسم کی روح پنہاں ہے جو منجمد ہو چکی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکمت آگین ارشاد ہے:۔

قُل کونوا حِجارۃً اَوحدیداً (۱۷/۵۰) آپ فرمادیجئے کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ۔ اگرچہ خداوندِ عالم نے یہ امر آنحضرتؐ کے توسط سے فرمایا، تاہم یہ فرمانِ خداوندی آیۂ "کُن فیکُون" کی تفسیر و تشریح ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جس طرح روحِ انسانی کا عروج ہوتا ہے، اسی طرح اسفل سافلین (۹۵/۵) کی طرف اس کا نزول بھی ممکن ہے۔

سوال نمبر ۱۱ : خداوند تعالیٰ نے کس طرح آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے مسخّر کر دیا ہے ؟ کس معنیٰ میں اللہ کی ظاہری اور باطنی نعمتیں آدمیوں پر پوری ہو چکی ہیں ؟ نیز یہ بتائیں کہ یہاں جیسے علم، ہدایت اور کتابِ منیر کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے ؟

جواب : تمام انسانی روحوں کی ایک آخری اور انتہائی عظیم مشترکہ روح ہے، جس کے بہت سے نام ہیں، جیسے روحِ ارواح، نفسِ واحدہ، نفسِ کُلّی وغیرہ، وہ ساری کائنات کا جوہر اور جان ہے، جس کا مظہر انسانِ کامل ہیں، سو وہ تمام مومنین جو اس مظہر کے وسیلے سے عالمگیر روح سے واصل ہو جاتے ہیں، وہ جملہ کائنات کو اپنے لئے مسخر پاتے ہیں، اور اسی وصال میں خدا کی ظاہری اور باطنی نعمتیں کسی کمی کے بغیر حاصل ہیں۔

یہاں علم سے داعی مراد ہے، کیونکہ اس کو علم الیقین کا درجہ حاصل ہے، ہدایت کا مطلب حُجّت ہے، جو عین الیقین کے مقام پر ہے، اور کتابِ مُنیر امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں، جو حقّ الیقین کا مرتبہ رکھتے ہیں، جو سرچشمۂ نور ہیں اور نور بکھیر دینے والے ہیں۔

سوال ۱۲ : آیت نمبر ۲۲ کی وضاحت کیجئے، اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی کی کیا تاویل ہے ؟

جواب : اسلام کے بعض امور میں خانۂ خدا کی طرف رُخ کرنا واجب

اور ضروری ہے، چہرۂ جان کو ہر وقت خود خدا کی طرف رکھنا قبلۂ ظاہر سے بڑھ کر ہے، اور چہرۂ روح یعنی اناے علوی کو اُس ذاتِ یکتا کے سپرد کر دینا سب سے بڑا کام ہے، اور لفظ اسلام میں سب سے خاص معنی یہی پوشیدہ ہیں، اس سپردگی (تسلیم) کا یہ مطلب ہے کہ نظریۂ اسلام کے مطابق انسانی روح کے بالائی سرے کو ہمیشہ ہمیشہ نورِ خدا سے وابستہ مانا جاتا ہے، جس طرح شعاعیں ہر وقت سورج سے وابستہ رہتی ہیں، چنانچہ جو شخص اس معنیٰ میں چہرۂ روح کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اس نظریئے کے ساتھ ساتھ نکوکار بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام رکھا ہے، اور یہ حلقہ یعنی العُروۃ الوثقیٰ ولایتِ اُئمۂ ھُدیٰ ہے۔

سوال نمبر ۱۳: آیت نمبر ۲۵ کی کوئی خاص حکمت بیان کیجئے۔

جواب: اس آیۂ مبارکہ میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر لوگ اس بات کا اقرار تو کرتے ہیں کہ خدا ہے اور اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، مگر ان کے کفر کی خاص وجہ جہالت ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۴: اور اگر زمین بھر کے درخت قلم بن جائیں، اور بحرِ محیط (دنیا بھر کا پانی) کے علاوہ اس جیسے سات سمندر اور سیاہی بن جائیں، تو پھر بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ اس ارشاد میں کلمات سے کیا مراد ہے؟

جواب : ان کلمات سے کلماتِ تامات مراد ہیں، اور خاص کر کلماتِ کُن، کہ وہ اگرچہ ایک ہی ہے، مگر اس کے مظاہرے بے شمار ہیں، کیونکہ ہر کامل انسان میں کلمۂ کُن کا صرف ایک ظہور نہیں بلکہ بہت سے ظہورات ہیں اور ایک علمی کائنات ہے، اور ایسی کائناتوں کے سلسلے کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، انہی معنوں میں خداوند تعالیٰ کے کلمات کبھی ختم نہیں ہوتے، جن میں عقل و روح کی دنیائیں پوشیدہ ہوا کرتی ہیں۔

سوال نمبر ۱۵ : مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) اس آیۂ حکمت آگین کی توضیح کر کے سمجھا دیں۔

جواب : (الف) انبیاء و ائمہؑ صلوات اللہ علیہم میں سے ہر ایک اپنے وقت کا نفسِ واحدہ ہوا کرتا ہے، جو اپنی ذات میں ایک ہوتا ہے اور خلائق کے تمام نفوس کو اپنے ساتھ ایک کر لیتا ہے، جبکہ اس کی روحانی تخلیق و تکمیل میں بھی اور انبعاث میں بھی یہ نفوس غیر شعوری حالت میں ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ (ب) مذکورہ آیۂ کریمہ کی حکمت یہ بتاتی ہے کہ جب بھی ہو تم میں سے ہر ایک کا شعوری اور روحانی جنم، نفسانی موت، اور انبعاث اسی طرح ہوگا، جس طرح نفسِ واحدہ کا ہوتا ہے۔ (ج) اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب کے لئے روحانی ترقی کا راستہ ایک ہی ہے جو صراطِ مستقیم ہے، جس پر عظیم ارواح آگے بڑھ چکی ہیں۔

سوال نمبر ۱۶ : قرآنِ حکیم اس دستورِ خداوندی کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے کہ وہ قادرِ مطلق دو متضاد چیزوں کو ایک دوسرے سے پیدا کرتا ہے اور ایک دوسرے میں پوشیدہ رکھتا ہے، جیسے رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے (۳۱/۲۹) اس قانون کی طرف توجہ دلانے کا خاص مقصد کیا ہے؟

جواب : اس کا مقصد بہت عظیم ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم قانونِ اضداد کو خوب گہرائی سے سمجھ لیں، کہ کس طرح نیستی میں ہستی کی صورت پنہان ہے اور کس طرح ہستی میں نیستی کی امکانیت پوشیدہ ہے، دنیا سے کیسے آخرت بنتی ہے اور آخرت سے کیسے دنیا وجود میں آتی ہے، اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ قرآن کی بہت سی حکمتیں مثبت و منفی دونوں پہلو رکھتی ہیں، ان میں سے اگر ایک پہلو ظاہر ہے تو دوسرا پوشیدہ ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۱۷ : شمس، قمر، اَجَلِ مُسَمّیٰ، اور فلک (کشتی) کی تاویل کیا ہے؟ نیز اس آیۂ مقدسہ کا مطلب بتائیں :

اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ علم السّاعۃِ۔

جواب : شمس و قمر، یعنی سورج اور چاند کی تاویل سب سے پہلے ناطقؑ و اساسؑ، پھر اساسؑ و امامؑ، اور اس کے بعد امامؑ اور حُجّت ہے، اَجَلِ مُسَمّیٰ حضرتِ قائمؑ، کشتی جو بحرِ روحانیت میں چلتی ہے، امامِ زمانؑ کا نور ہے، جو اللہ تعالیٰ

کا زندہ اسمِ بزرگ اور نورِ ذکر ہے۔

آیت کا مطلب: بیشک خدا کے پاس قیامت کا علم ہے یعنی جن کامل انسانوں کو اللہ کا قربِ خاص حاصل ہو اُن کو قیامت کا عملی علم ہو جاتا ہے۔

خاکِ پائے مومنان
نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی
۷؍ جون ۱۹۸۴ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

حکمتِ شُکر

صدرِ عالیقدر فتح علی حبیب اور ان کی فرشتہ خصلت بیگم گُل شکر کو خداوندِ قدوس ہر طرح کی کامیابی اور سرفرازی عنایت فرمائے! میں اپنی اصل روح اور حقیقی انا سے یاعلی مدد کا خصوصی سلام کرتا ہوں، اور اسی جذبۂ خیرخواہی سے جملہ عزیزانِ شرق و غرب کے حق میں بھی انتہائی عاجزانہ دعائیں کرتا ہوں، قبول ہوں:
پروردگارِ عالم تمام مومنین پر بدرجۂ انتہا مہربان ہو! آمین یاربّ العالمین!!

میری اہلیہ عائشہ بیگم نصیر اس سے قبل کہ ہونزہ کی جانب روانہ ہو جائیں مجھ سے بار بار عرض کر رہی تھیں کہ میں ان کی اور اپنی طرف سے خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کے تمام جاں نثار اور فرشتہ صفت عملدار اور ارکان کا صمیمیتِ قلب سے شکریہ ادا کروں، کیونکہ انہوں نے جس خلوص و محبّت سے میری فیملی کی ہر گونہ مدد کی ہے وہ بے مثال اور ناقابلِ فراموش ہے، اور حق بات یہ ہے کہ میری

بیگم جملہ عزیزان کے فرزندانہ تعاون سے بے حد متأثر ہو گئی ہیں، وہ خصوصاً گل شکر فتح علی اور یاسمین محمد کی مسلسل مہمان نوازیوں اور گوناگون احسانات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتی ہیں۔ وہ ہر بار ان خداداد (GOD GIVEN) عزیز بیٹیوں کی تمام تر فرشتگانہ خصلتوں کا تذکرہ کرتی رہتی تھیں۔

میں نے محترمہ عائشہ بیگم کو تفصیلاً بتا دیا کہ یہ علمی خطوط اور دوسرے علمی مقالے کہاں کہاں تک جاتے ہیں، اور ہمارے عزیزان جو مولائے پاک کے علمی لشکر کا ایک فاتح دستہ ہیں ان اہم تحریروں کو کس شوق و جذبہ سے پڑھا کرتے ہیں، اس سے ان کو بڑا تعجب ہوا، اور احساسِ شکرگزاری بھی، انہوں نے کہا کہ یہ مالکِ حقیقی کی بہت بڑی رحمت ہے کہ آپ کے بیحد عزیز شاگرد، سب کے سب ہر وقت حصولِ علم اور پیاری جماعت کی اعلیٰ ترین علمی خدمت کے لئے مستعد رہتے ہیں، آپ نے جس طرح انتہائی سخت مصائب و آلام میں صبر کا راستہ اختیار کیا تھا، وہ عمل یقیناً مولا کی خوشنودی کا باعث ہوا ہو گا، اسی لئے اُس مہربان خداوند نے ان پاک باطن اور روشن ضمیر فرشتگانِ ارضی سے آپ کی یہ شاندار مدد کی ہے، ان کا یوں کہنا بالکل بجا تھا، اس احساسِ نعمت کے نتیجے میں ہم نے خداوند تعالیٰ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا شکر ادا کیا۔

یہ اہم نکتہ یاد رہے کہ ایک مومن کی زندگی میں صبر کے مواقع پہلے آتے ہیں، اور شکر کے مقامات بعد ہیں، اور شکرگزاری ہی ایک ایسی عبادت ہے، جسمیں سب سے زیادہ خوشیوں اور مسرتوں کے احساس وادراک کا امکان ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ بندگی علم و حکمت کی روشنی میں ہو، اگرچہ ہر عبادت میں لذت و شادمانی کی معجزانی روح پوشیدہ ہوا کرتی ہے، تاہم شکرگزاری وقدر دانی اہلِ بہشت کی عبادت ہے، چنانچہ جب کسی نعمت پر علمی وعرفانی شکرگزاری کی روشنی پڑتی ہے، تو وہ اپنے تمام تر معنوی حسن و جمال اور قدر وقیمت کے ساتھ تصوّر میں اُجاگر ہو جاتی ہے، یہ اس سوال کا مختصر سا جواب ہے، جو کوئی بھی علم جُو پوچھ سکتا ہے کہ حقیقی شکرگزاری سے اس قدر لذت وخوشی کیوں ملتی ہے؟

سورۂ لقمان (۳۱/۱۲) سے ایک تو یہ ظاہر ہے کہ ربِّ کریم کی سب سے بڑی نعمت حکمت کی صورت میں ہے بلکہ وہ تمام اعلیٰ نعمتوں کا مجموعہ ہے، دوسرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکمت ایک نور ہے، جس کی روشنی کے بغیر عقلی، روحی، اور جسمی نعمتوں کی شکرگزاری اور قدردانی کما حقہ ادا نہیں ہو سکتی، چنانچہ خداوندِ عالم نے حضرت لقمان کو حکمت عطا کر کے فرمایا کہ اس کا مقصد شکر کرنا ہے سو جو شخص حکمت کی روشنی میں فریضۂ شکرگزاری کو انجام دیتا ہے، اس کا فائدہ خود اسی کو ملتا ہے۔

سورۂ سبا میں ارشاد ہے: اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِيَ الشَّكُوۡرُ (۳۴:۱۳) اے داؤد کے خاندان والو! تم سب شکریہ میں نیک کام کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔ اس حکم عالی سے صاف ظاہر ہے کہ مکمل شکر گزاری عملی صورت میں ہوا کرتی ہے، یعنی مالی، جسمانی، عقلی اور علمی نعمتوں میں سے جو کچھ میسّر ہوا ہو، اس کو استعمال کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچانا عملی اور حقیقی شکر گزاری کہلاتی ہے۔

آلِ داؤدؑ کا مفہوم کافی وسیع ہے، کیونکہ یہ لفظ آلِ ابراہیمؑ ہی کی طرح ہے، جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام امامِ مستودع اور تختِ روحانیت کے مالک تھے، اور یہ مرتبہ آپؑ کی نسل میں بھی جاری تھا، چنانچہ سلسلۂ آلِ داؤدؑ نے اپنی عظیم روحانی سلطنت کا حقِ شکر گزاری اس طرح ادا کیا کہ انہوں نے نورِ ہدایت کی روشنی میں اہلِ ایمان کو منزل بمنزل آگے بڑھا دیا، یہ اُن حضرات کی عملی شکر گزاری تھی، اور انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کا فریضۂ شکر اسی طرح ادا ہوا کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں شکر سے متعلق آیات موجود ہیں، ان سب میں کسی بھی اندازِ حکمت سے انتہائی عظیم نعمتوں کا ذکر فرمایا ہوا ہے، جیسے فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(۲۶/۵) پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھایا، تمہارے مر جانے کے بعد تاکہ تم شکر کرو۔ یہ جسمانی موت اور پھر جسمانی طور پر زندہ ہو جانے کی بات نہیں، بلکہ یہ معجزۂ اِنبعاث کا ذکر ہے، جس کا مقالہ آپ پڑھ چکے ہوں گے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: اور اُس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو (۱۶/۷۸) اس فرمانِ الٰہی میں باطنی کان، چشمِ روح اور حقیقی دل کا تذکرہ ہے، اور اسی وجہ سے شکر مقصود ہے۔

فرمانِ خداوندی ہے: فاتقوا اللّٰہَ لعلّکم تشکرون (۳/۱۲۳) پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر کرو۔ یعنی متّقی بن جاؤ تاکہ تمہیں خدا تعالیٰ کی عظیم نعمتیں حاصل ہوں، تاکہ تم آخر کار شاکر ہو سکو گے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ منزلِ شکر آخر میں آتی ہے۔

سورۂ ابراہیم (۱۴/۵) کا مفہوم ہے: اور ان کو اللہ کے ایّام یعنی چھ عظیم پیغمبروں کی روحانیت یاد دلاؤ، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ہر صابر اور شاکر کے لئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر پہلے آتا ہے اور شکر آخر میں۔

سورۂ زُمر میں فرمایا گیا ہے: بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۳۹/۶۶) بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرنا اور شکر گزاروں میں سے ہو جانا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ شکر گزاری ایک خاص عبادت

ہے جو عام عبادات کے بعد آتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: اے اُن لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کیا تھا وہ نوح بڑے شکرگزار بندے تھے (۱۷/۳) اس میں اشارتاً حضرت نوح علیہ السّلام کی روحانیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کیونکہ کامل انسانوں کی شکرگزاری روحانی اور عقلی نعمتوں کے مقام پر ہوتی ہے۔

ایک آیۂ کریمہ کا مفہوم ہے (۷/۵۸) خداوندِ عالم شکرگزار اور قدردان لوگوں کے لئے آیات کو طرح طرح سے بیان کرتا ہے یعنی وہ ایسی بہت ساری مثالیں بیان فرماتا ہے کہ ان سب کا ایک ہی ممثول ہے۔

ایک ہی ممثول (حقیقتِ واحدہ) امامِ زمان علیہ السّلام ہیں، اور اسی پاک ہستی کی بہت سی مثالیں اور کثیر نام ہیں، چنانچہ آپؑ ہی خداتعالیٰ کا زندہ اور نورانی اسمِ اعظم ہیں، اور آپؑ ہی اس کے مقدّس نور کے مظہر ہیں، الحمد للّٰہ علیٰ منّہٖ و احسانہ۔

مومنوں کی خاکپا

نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی

۱۱ر جون ۱۹۸۴ء

نوٹ: شکر کے قرآنی موضوع میں بلندترین نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، اور وہ ایسی نعمتیں ہیں جو صرف اور صرف مومنین ہی کیلئے مخصوص ہیں۔

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

Table of Contents